فکر و تحقیق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سہ ماہی

فکر و تحقیق

نئی دہلی

جلد ۳ — شمارہ ۱

جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۰ء

مُدیر اعلیٰ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

مشیر

مخمور سعیدی

مُدیر

انوار رضوی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language

Quarterly "FIKR-O-TAHQEEQ" New Delhi
Vol. III January, February, March 2000 Issue - 1

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

سہ ماہی فکر و تحقیق نئی دہلی

(علمی و تحقیقی جرنل)

National Council for Promotion of Urdu Language
ACC No. 5187 ... 2010
15/10/06

اس شمارے کی قیمت	:	25 روپے
زر سالانہ	:	100 روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے	:	140 روپے

طابع اور ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
محکمہ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی
فون- 6103938, 6103381

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
مدیر : انوار رضوی
مشیر : مخمور سعیدی

فکر و تحقیق کے مشمولات میں ظاہر کردہ آرا سے قومی اردو کونسل کا اتفاق ضروری نہیں۔
فکر و تحقیق میں شامل مضامین کی نقل یا ترجمے کے لیے ناشر کی اجازت ضروری ہے۔

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲ میں چھپوا کر شائع کیا۔

ترتیب

1.	ہماری بات	محمد حمید اللہ بھٹ	5
2.	جلیل مانک پوری۔ عہد اور کلام ایک جائزہ	راج بہادر گوڑ	9
3.	نذیر احمد کے ناولوں میں بیانیہ اور منشائے مصنف کے مسائل	ابوالکلام قاسمی	19
4.	ہیر وارث شاہ : ایک نیا تعارف	شکیل الرحمٰن	35
5.	مرزا غالب اور اودھ اخبار ۱۸۶۰ء — ۱۸۷۰ء	اکبر حیدری کشمیری	43
6.	کثیر لسانی پس منظر میں اردو طبقے کا لسانی انداز فکر	اے۔ آر۔ فتیحی	67
7.	تحریکِ آزادی میں اردو صحافت کا حصّہ	گربچن چندن	81
8.	انعام اللہ خاں یقین	شکیل جہانگیری	129
9.	اڑیسہ کے ایک گمنام صوفی شاعر: مولوی محمد سلطان راجی	حفیظ اللہ نیولپوری	143
10.	کلامِ درد کی مختلف اشاعتیں	نسیم احمد	157
11.	فراق گورکھپوری کے ساتھ ایک یادگار ملاقات	کمال احمد صدیقی	165

فارم ۴۔ / Form IV

1- اشاعت کی جگہ — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۶

2- اشاعت کی مدت — سہ ماہی

3- طابع کا نام و پتہ — لبرٹی آرٹ پریس
دریا گنج نئی دہلی-110002
کیا ہندوستانی شہری ہے — ہاں

4- ناشر کا نام و پتہ — ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۶
کیا ہندوستانی شہری ہے — ہاں

5- مدیر کا نام و پتہ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۶
کیا ہندوستانی شہری ہے — ہاں

6- اس فرد اور پارٹنر کا نام و پتہ جو جریدہ کا مالک ہے۔ — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۶

میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم کی رو سے بالکل صحیح ہیں۔

ناشر کے دستخط

ہماری بات

"فکر و تحقیق" اپنے قلمی معاونین اور قارئین کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ گزشتہ برس کے مانند اس برس بھی آپ سب کا تعاون اس کو حاصل رہے گا۔ یہ شمارہ، پیشِ خدمت ہے جو دس علمی و تحقیقی مضامین پر محیط ہے۔

اس شمارے کا آغاز بزرگ ادیب و نقاد ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے تنقیدی مقالے "جلیل مانک پوری۔ عہد اور کلام" سے ہوتا ہے۔ جلیل کلاسیکی شعراء کے آخری طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بعد اردو شاعری کا رنگ و آہنگ بدلتا چلا گیا اور اس کی پرکھ کے پیمانے بھی۔ ڈاکٹر گوڑ نے جلیل مانک پوری کے کلام کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے اور دقت نظر سے بحث کی ہے۔

دوسرا مضمون پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا "نذیر احمد کے ناولوں میں بیانیہ اور منشائے مصنف کے مسائل" ہے۔ پروفیسر قاسمی ہمارے ان تازہ کار نقادوں میں سے ہیں جو ادب کو نئے زاویوں سے دیکھنے اور تنقید میں نئے گوشے تراشنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں قارئین کو سوچ کے لیے نئے موضوعات ہاتھ آئیں گے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کا خاص میدان جمالیات ہے تاہم ان کا مقالہ "ہیر وارث

شاہ۔ ایک نیا تعارف" بالکل اچھوتے انداز کا ہے۔ ضروری ہے کہ قارئین اردو اپنی زبان کے ادب کے ساتھ دیگر ہندستانی زبانوں کے ادب سے بھی آگاہی حاصل کریں۔ ہم اس نوع کے مضامین کا برابر خیر مقدم کریں گے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کا شاملِ اشاعت مضمون "مرزا غالبؔ اور اودھ اخبار ۱۸۶۰ء -۱۸۷۰ء" تحقیقی نوعیت کا ہے۔ پروفیسر اکبر حیدری ہمارے صفِ اوّل کے محقق ہیں اور ان کی ہر تحریر تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ کا حکم رکھتی ہے۔ اس مضمون سے مرزا غالبؔ کی زندگی کے بعض حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے اور انیسویں صدی کا منظر نامہ کچھ اور واضح ہوتا ہے۔

شمارے میں شامل ڈاکٹر اے۔ آر۔ فتیحی کا مضمون "کثیر لسانی پس منظر میں اردو طبقے کا لسانی انداز نظر" اردو کی ترویج و ترقی کے لیے بعض لسانی جائزوں کی ضرورت اور اہمیت سے بحث کرتا ہے۔ ڈاکٹر فتیحی کی تجاویز پر غور و فکر اور عمل در آمد کی ضرورت ہے۔ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

جناب گربچن چندن کا مضمون "تحریکِ آزادی میں اردو صحافت کا حصہ" اردو صحافت کی تاریخ کے روشن باب کو بیان کرتا ہے۔ چندن صاحب اردو صحافت پر اتھارٹی ہیں اور یہ موضوع ان کو خوب زیب دیتا ہے۔ یہ مضمون ایک اعتبار سے اردو زبان کے وقار کو بحال کرنے اور اردو صحافت کو اعلیٰ معیار یاد دلانے کی بھی کوشش ہے۔

ڈاکٹر شکیل جہانگیری کا مضمون "انعام اللہ خاں یقینؔ" کافی تحقیقی کاوش سے لکھا گیا ہے، یقینؔ ہمارے کلاسیکی شعرا میں متنازعہ فیہ شخصیت کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر جہانگیری نے یقینؔ کی کئی جہات پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی ضمن میں کلاسیکی شعرا کے ایک طرزِ سخن ایہام گوئی کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ بحث مروجہ زاویہ سے ہی کی گئی ہے گو کہ ہمارے عہد میں ایہام گوئی کے حق میں اکا دکا زوردار آوازیں سنائی دے چکی ہیں اور نئے سرے سے اس کی تعین قدر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

حفیظ اللہ نیولپوری کا مضمون "اڑیسہ کے ایک گمنام صوفی شاعر : مولوی محمد سلطان راحیؔ" بادی النظر میں کھوئے ہوؤں کی جستجو کی جہت میں ایک قدم ہے اور ڈیڑھ سو سال پہلے کے اڑیسہ میں اردو کی مقبولیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس شمارے میں شامل جناب نسیم احمد کا مضمون "کلام درد کی مختلف اشاعتیں" تحقیقی نوعیت کا ہے۔ کلاسیکی شعرا میں خواجہ میر درد کا درجہ بہت بلند ہے۔ دردؔ پر کام کرنے والے محققین کے لیے یہ مضمون کافی کار آمد ثابت ہوگا۔

مرحوم فراقؔ گورکھپوری کا ایک انٹرویو بھی شائع کیا جارہا ہے۔ اس کا متن ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے فراہم کیا ہے۔ انھوں نے ہی یہ انٹرویو بھی لیا تھا۔ فراقؔ صاحب گفتگو میں خوب کھلتے تھے اور اکثر اوقات نادر نکات بیان کرجاتے تھے۔ ان کے تمام انٹرویو اور تقریریں شائع کرنے اور وسیع حلقہ تک پہنچانے کے لائق ہیں۔

ہم اردو زبان و ادب کے علاوہ دوسرے علمی موضوعات مثلاً فلسفہ، نفسیات، تاریخ وغیرہ بشمول دیگر ہندستانی زبانیں اور ان کے ادب پر بھی علمی مضامین کا خیر مقدم کریں گے۔

محمد حمید اللہ بھٹ

جامع
انگریزی۔اردو لغت
جلد اوّل تا ششم

مدیر اعلیٰ
کلیم الدین احمد

☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرّہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اُردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر اُردو الفاظ فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

☆ تمام مروّج علوم و فنون سے متعلق انگریزی۔اُردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔

☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو ویبسٹر کلاں کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

☆ اُردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔

☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ ....

☆ دو سو سے زائد سائنسی و سماجی علوم و فنون پر محیط ....

☆ امریکی / برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ ....

☆ قومی اُردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ .... ایک تاریخی دستاویز

بڑا سائز ۹×۵ء۱۱۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت .... کمپیوٹر شدہ کتابت

مضبوط و مطلا جلد .... صفحات: جلد اوّل (۱۲۱۷، قیمت ۴۰۰)، جلد دوم (۱۰۶۲، قیمت ۶۰۰)، جلد سوم (۱۰۹۱، قیمت ۶۰۰)، جلد چہارم (۸۶۶، قیمت ۶۰۰)، جلد پنجم (۱۰۴۲، قیمت ۶۰۰)، جلد ششم (۱۰۱۲، قیمت ۶۰۰)

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت۔

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔۱، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔006 110
فون : 6103381, 6103938, 6179657 فیکس : 6108159

حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد۔500002

راج بہادر گوڑ

جلیلؔ مانک پوری — عہد اور کلام

ایک جائزہ

جلیلؔ مانک پوری ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ کوئی ۲۰ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور ۶۰ سال شعر کہتے رہے۔ اس لحاظ سے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کا زمانہ ان کی شاعری کا زمانہ رہا ہے۔ اور یہی اُردو شاعری میں انقلاب اور اتھل پتھل کا دَور رہے۔ اُردو کے نشاۃ الثانیہ کا دَور ہے۔ جلیلؔ کی شاعری کو ان کے عہد کی اس خصوصیت کے پس منظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔

جلیلؔ، امیرؔ مینائی کے شاگردِ رشید رہے ہیں۔ ویسے داغؔ اور امیرؔ ہم عصر ہی ہیں، ان دونوں کے شاگرد ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ جلیلؔ جس زمانے میں شاعری کے میدان میں اُترے ہیں، اس وقت داغؔ اور امیرؔ چھائے ہوئے تھے۔ مجنوںؔ گھورکھپوری نے بے لوک کہہ دیا ہے :-

"امیرؔ، داغؔ اور ان کے شاگرد انحطاطی غزل سرائی کی آخری کڑی تھے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ہم ان کو ایک ردّعمل ماننے کے لیے مجبور ہیں۔ ان سے پہلے غالبؔ اور مومنؔ کی پیچیدہ خیالیوں اور مشکل گوئیوں اور ناسخؔ اور ان کے مدرسہ کی شاعرانہ بنوٹ سے ہم اُکتا سے گئے تھے اور جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ ان کو بالکل اپنے سے غیر مانوس پاتا تھا۔ اسی لیے جب داغؔ کی عشقیہ واقعیت اور امیرؔ کی پُر تکلف عمومیت نے جس کا تعلق جذبات کی اصلیت سے زیادہ زبان اور محاورے کی سلاست اور عام فہمی سے تھا،

سستے قسم کی لذت پرستی اور خوش باشی کے سامان بہم پہنچانا شروع کیا تو ہم نے ان کو اپنے سے بہت قریب تر پایا۔"

(نگار ۔ جنوری ، فروری ۱۹۵۲ء)

مجنوں نے آگے چل کر اسی مضمون میں کہا ہے۔

" امیر و داغ نے اردو زبان کی جمہوریت کو مستحکم بنایا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے اس میں رکاکت، ابتذال اور پستی کی لے بھی ان ہی بزرگوں کے دم سے بڑھی۔"

اصل میں ادب میں یہ ابتذال اس دور کے سماجی انحطاط کا عکس ہی تو تھا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنی تصنیف " مطالعہ امیر " (ص ۲۴) میں یوں کہا ہے:۔

" اودھ کا علاقہ بڑا زرخیز تھا۔ عام خوش حالی کے علاوہ یہاں کے حکمراں، اُمرا اور ان کے متوسلین بے اندازہ دولت کے مالک تھے، دولت کی افراط اور انگریزوں کی سیاست گری کے مفلوج کن اثرات نے ان کو تفنن اور تعیش کی طرف مائل کیا۔ حکمران خاندان کا ایران سے نسلی تعلق، اودھ کی رومان انگیز روایات اور انگریزوں کی مادہ پرست زندگی کی جھلکیاں مزید رنگ لائیں۔ طوائفوں اور دوسری فاحشہ اور ادنیٰ درجے کی عورتوں سے تعلق اور مسکرات کا استعمال لوازماتِ امارت میں داخل ہو گیا۔ نوابین اور امرا سے گزر کر یہ میلانات عوام الناس تک پہنچے اور تفنن اور تعیش اور ابتذال و بازاریت لکھنؤ کی معاشرت کے امتیازی نشانات بن گئے۔"

ان حالات میں سنگلاخ زمین میں کرتب دکھانا، قادر الکلامی کا مظاہرہ، جدتِ اختراع کا جنون، رعایت لفظی کا تماشا، اس قسم کی باتوں نے شعر کو گرا دیا تھا۔

باعثِ گریہ ہوئی فرقت میں مجھ کو مے کشی
ساقیا اشکوں سے مے کا استحالہ ہو گیا (ناسخ)

(استحالہ یعنی محال و ناممکن ۔ طبی اصطلاح)

یک مُشتِ استخواں پہ نہ اتنا غرور کر
قبریں بھری ہوئی ہیں عظامِ رمیم سے (آتش)

جدت اور اختراع کے جنون نے شعر کو کس قدر مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔

چشم میں سُرمہ کا دُنبالہ بنا کر بولے
کیوں عصائیک کے لکڑی ہو جائے میری آنکھ (وزیر)

مست ہاتھی ہے تیری چشمِ سیہ مست اُسے یار
صفِ مژگاں اُسے گھیرے ہوئے ہے بھالوں سے (آتش)

نوکِ مژہ پہ اشکِ صباحت نظام ہے
سونٹے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے (بحر)

مبتذل اور مضحک اشعار کے نمونے ملاحظہ ہوں ــــ

کس قدر صاف ہے تمھارا پیٹ
صاف آئینہ ہے سارا پیٹ (ناسخ)

اس کی انگیا کی کٹوری کو ہُوا دیکھ کے مست
ساقیا اب نہ دِکھا ساغرِ صہبا مجھ کو (ناسخ)

ہوں گے ہم تیری چال سے محرم
بند انگیا کا جب کہ وا ہوگا (امانت)

عبدالسلام ندوی نے اس مخصوص رنگ کو "بوالہوسانہ شوخی" کا نام دیا ہے ۔ ان لوگوں نے "عشق و محبت کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر معشوق سے بے محابانہ گفتگو شروع کی ۔"

(حوالے کے لیے ملاحظہ ہو "مطالعہ آمیر"۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ص۱۹)

امیر مینائی نے جہاں اساتذہ کی تقلید میں بھی شعر کہے ہیں وہ بھی اپنے دَور

کے انحطاط کو منعکس کرتے ہیں۔

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں (غالب)

ہٹاؤ آئینہ امیدوار ہم بھی ہیں
تمہارے دیکھنے والوں میں یار ہم بھی ہیں (امیر)

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں (مومن)

دیکھو جما کے آنکھ نہ دیکھو رقیب کو
چھریاں بھری ہوئی ہیں تمہاری نگاہ میں (امیر)

مجنوں نے اس دور کی شاعری کے بارے میں کہا ہے۔

"غیر شعوری طور پر یہ اشعار بھی اپنے دَور کی معاشرت کی پوری طرح آئینہ داری کرتے ہیں۔ یعنی یہ اشعار اس امر کا ثبوت ہیں کہ مردہ معاشرت سچائی اور خلوص سے بالکل بے گانہ ہو چکی ہے اور اب چونکہ وہ بے مایہ ہے اس لیے اپنی بے مائیگی کا پردہ رکھنے کے لیے ریا اور نمائش سے کام لے رہی ہے ... اس قسم کی شاعری نہ صرف شاعر کے بگڑے ہوئے تخیل کا ثبوت ہے بلکہ اس بات کی بھی شہادت ہے کہ سارے معاشرتی نظام میں فساد پیدا ہو چلا ہے اور اب اس کے بدلنے کی سخت ضرورت ہے"

(نگار۔ جنوری، فروری ۱۹۵۷ء صفحات ۲۳ و ۲۴)

اس شاعری نے حالی کو غزل پر فردِ جرم لگانے پر مجبور کیا۔ اور شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی کہ غزل میں اصلاح کی جائے۔ غزل کے ساتھ سخت زیادتی ہوگی اگر اسے خالص عشقیہ شاعری کا مترادف اور اسی چار دیواری میں محصور

اور محدود سمجھا گیا۔ غزل کی تاریخ شاہد ہے کہ ایک صنفِ شاعری کی حیثیت سے مضامین اور طرزِ اظہار دونوں معنوں میں اس میں بہت وسعت اور گنجائش موجود ہے۔ ادا بندی اور معاملہ بندی کے علاوہ کون سا مضمون ہے جو غزل کی زبان میں ادا نہیں ہوا۔ تصوّف، فلسفہ، زندگی کی گوناگوں کیفیات سبھی کے لیے غزل کا دامن کھلا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ غزل کی مختصر گوئی کا اندازِ علامتوں کی زبان میں بولنے کا طریقہ، اس کی اشاریت اور ایمائیت اس کی بیانیہ صلاحیتوں کو بہت وسعت بخشتے ہیں۔ اسی بنا پر نیازؔ فتحپوری نے کہا تھا ـــ

"اگر ہم غزل کو صرف حسن وعشق تک محدود نہ رکھیں تو ہمیں اس کا حال و مستقبل دونوں بہت شاندار نظر آتے ہیں اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلوبِ بیان کے جتنے نئے طریقے اب نظر آتے ہیں وہ اس سے پہلے کبھی نہ پائے جاتے تھے۔"

(نگار۔ جنوری، فروری ۱۹۴۱ء)

اسی دَور میں جب حسرتؔ نے کہا ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

تو یہ لے ہمیں نئی نئی سی لگی۔ یا فراقؔ نے جب یہ کہا ؎

سمٹ سمٹ سی گئی ہے فضائے بے پایاں
بدن چرائے وہ جس دم ادھر سے گزرے ہیں

تو مصحفیؔ کی یاد آئی ؎

دِل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چُرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چُرا کر

اور ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ ہمارے نئے شاعر نے پرانے مضمون کو نئے آفاقی ابعاد عطا کر دیے ہیں۔

نظم تو نئی بلندیوں کو چھو ہی رہی تھی۔ لیکن غزل بھی نئی آن اور نئی شان سے نئے مضامین کے تحفے لیے بزمِ سخن میں آ رہی تھی۔

اس پس منظر میں جلیل مانک پوری کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ جلیل اپنے استاد امیر مینائی کے ساتھ لکھنؤ مکتب سے وابستہ ہیں۔ داغ اور امیر کے دَور میں بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر ـــ

"... چونکہ معاشرت کا ایک سِرا تہذیب و شائستگی اور دوسرا ابتذال و بازاریت سے ملا ہوا تھا، اس لیے زبان کے خزانے میں مہذب و شائستہ الفاظ و محاورات کے ساتھ مبتذل اور بازاری الفاظ و محاورات بھی تھے" (مطالعہ امیر۔ ص۳۰)

یہاں شعر میں ابتذال بھی ملتا ہے تو زبان کی جمہوری قدریں بھی مستحکم ہوتی نظر آتی ہیں۔ نکھار بھی پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے داغ "فصیح الملک" ہوئے تو جلیل نے "فصاحت جنگ" کا خطاب پایا۔

امیر مینائی نے جب امیر اللغات کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا اور رام پور میں اس کا دفتر قائم ہوا تو جلیل مانک پوری کو اس کی ادارت کا کام سپرد ہوا۔ جلیل کوئی ۵۲، ۵۳ سال کے ہوں گے کہ انھوں نے تذکیر و تانیث پر ایک کتاب لکھی جس میں کوئی ۷ ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث کی وضاحت کی۔ اس کتاب کا مقدمہ عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے۔ اُردو کے عروض اور اُردو میں مستعملہ بحروں پر ایک کتاب مرتب کی۔ اور "معیارِ اُردو" ایک کتاب تالیف کی جو اُردو محاوروں کا مجموعہ ہے۔

شعری مجموعے تین دیوان ہیں۔ "تاج سخن" (۱۹۱۰ء)، "جانِ سخن" (۱۹۱۶ء) اور "روحِ سخن"، "معراجِ سخن"، نعتیہ کلام ہے اور "گُلِ صدبرگ" رُباعیات کا مجموعہ ہے۔

"سرتاجِ سخن" نظام کی تعریف میں قصائد، قطعات وغیرہ کا مجموعہ ہے۔

ان کے علاوہ ۱۹۲۷ء میں سوانح امیر مینائی تصنیف و شائع کی۔

جلیل کی شاعری میں جہاں اُن کے پیش رو دور کی مبتذل شاعری کی یہ جھلک ملتی ہے ـــ

کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو
خنجر سے کاٹتا ہوں شبِ انتظار کو

تو یہ گمان ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ یہ جلیل کا غالب رنگ ہے۔ اصل میں جیسا کہ خواجہ حمید الدین شاہد نے "حیدرآباد کے شاعر" میں کہا ہے "جلیل کی شاعری قدیم رنگِ تغزل کی یادگار ہے۔ شاعری میں قدیم رنگ اور روایتی آہنگ کے استاد تھے۔"

نیاز فتحپوری جلیل کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں ــ

"آپ امیر مینائی کے شاگرد و جانشین ہیں اور ایسے شاگرد و جانشین کہ اگر آج امیر زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزل گوئی سے دست بردار ہو جاتے۔" (نگار ۔ جنوری ، فروری ۱۹۴۱ء، صـ)

اور صحیح یوں ہے کہ امیر کے پاس "بے تکلف عمومیت" تھی جو "سستے قسم کی لذت پرستی" کے سامان مہیا کرتی ۔ انھوں نے اگر داغ کے تتبع میں "عشق و محبت کے آداب کو بالائے طاق" رکھ دیا تھا اور "معشوق سے بے محابانہ" گفتگو کی تھی۔ تو جلیل نے عشقیہ شاعری کو اپنے روایتی آداب پھر سے عطا کر دیے تھے اور معشوق سے بات بھی کی تو اس میں رکھ رکھاؤ کو ملحوظ رکھا۔ اور یہی جلیل کا کارنامہ ہے ۔

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینو
جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور

—

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ
کوئی جینے کا سہارا ہی نہیں ہے

—

میری ہر بات کو اُلٹا وہ سمجھ لیتے ہیں
اب کے پوچھا تو یہ کہہ دوں گا کہ حال اچھا ہے

—

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

یہ چیدہ چیدہ اشعار دیوان "تاجِ سخن" سے ہیں۔ "جانِ سخن" میں کچھ ایسے اشعار ملیں گے۔

جلیلؔ آنے لگی ہیں ہچکیاں اب
کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں

تلاشِ یار لے آئی یہاں تک
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بت خانے سے

میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے
جب بہار آئی، توڑ ڈالی ہے

جلیلؔ کے تیسرے دیوان "روحِ سخن" میں یہ شعر ملتے ہیں۔

ملتی جلتی ہے قیامت سے شباہت لیکن
ایک ذرا رنگ ہے گہرا شبِ تنہائی کا

نفس کی طرح کوچے میں کسی کے
ہزار دل بار میں آیا گیا ہوں

نہ اشارہ، نہ کنایہ، نہ تبسم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

یا پھر یہ شعر سنیے:۔

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے مے خانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلا راز جلیلؔ
خلد کہتے ہیں جسے نام ہے مے خانے کا

ساقی تیری شراب جو شیشے میں تھی پری
ساغر میں آ کے اور بھی سانچے میں ڈھل گئی

جلیلؔ صرف الفاظ کے ہیر پھیر کے لیے شعر نہیں کہتے ۔ اُن کے شعر کا ہلکا ترنم پڑھنے والے کو گنگنانے کی طرف مائل کرتا ہے ۔ نیازؔ فتحپوری نے جلیلؔ کی غزل گوئی کے بارے میں کہا ہے ۔

" جنابِ جلیلؔ کے یہاں سلاستِ بیاں کا یہ عالم ہے کہ گویا ایک نرم و سبک رَو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے ۔ ان کا لکھنوی رنگِ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اس قدر دل نشیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے ۔"

سادگی ، روانی ، اور بے تکلفی جلیلؔ کے کلام کا حُسن ہے ، یہ صحیح ہے کہ جلیلؔ حسرتؔ نہیں ۔ ہم عصر ہوتے ہوئے دونوں کے درمیان فاصلہ ہے ۔ اور یہ فاصلہ افتادِ طبع کا فاصلہ ہی نہیں زندگی کے ان دو راستوں کے درمیان فاصلہ ہے جو جلیلؔ اور حسرتؔ نے اختیار کیے تھے ۔ جلیلؔ درباروں میں رہے ، شاہوں اور شاہزادوں کو مشورۂ سخن دیتے تھے اور حسرتؔ شاہوں سے دور رہتے اور شہنشاہوں سے ٹکر لیتے تھے ۔ صوفی بھی تھے اور باغی بھی " مشقِ سخن " کے ساتھ " چکی کی مشقت " بھی کرتے تھے ۔ اسی لیے تو جلیلؔ اور حسرتؔ دونوں " پاس بیٹھے ہیں مگر دُور نظر آتے ہیں "

اہلِ اُردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اُردو انسائیکلوپیڈیا

جو بین الاقوامی معیاروں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے

۳۲ علوم پر مشتمل

تین جلدیں شائع ہو گئیں

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نے اُردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ ابتدائی تین جلدیں ۳۲ علوم پر مشتمل ہیں۔ جن کی ترتیب حسبِ ذیل طریقے پر کی گئی ہے۔

جلد اوّل : ۱۔ آثار قدیمہ ۲۔ ادبیات ۳۔ ارضیات ۴۔ انجینیرنگ
۵۔ تاریخ اسلام ۶۔ تاریخ عالم ۷۔ تاریخ ہند

جلد دوم : ۸۔ تعلیم ۹۔ جغرافیہ ۱۰۔ جنگلات ۱۱۔ حیاتیات
۱۲۔ حیوانیات ۱۳۔ ریاضیات ۱۴۔ زراعت 15۔ سائنس
۱۶۔ سماجیات ۱۷۔ سیاسیات ۱۸۔ طب یونانی ۱۹۔ طبیعیات

جلد سوم : ۲۰۔ علاج حیوانات ۲۱۔ فلسفہ و نفسیات ۲۲۔ لائبریری سائنس ۲۳۔ فلکیات
۲۴۔ فنون لطیفہ ۲۵۔ فلم ۲۶۔ قانون ۲۷۔ کیمیا
۲۸۔ مذاہب ۲۹۔ معاشیات ۳۰۔ معدنیات ۳۱۔ نشرو اشاعت
۳۲۔ نظم و نسق

جملہ علوم پر مختصر نوشتے آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشین پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔

جلد اوّل	578 صفحات	قیمت	-/300 روپے
جلد دوم	568 صفحات	قیمت	-/450 روپے
جلد سوم	614 صفحات	قیمت	-/450 روپے

مندرجہ ذیل پتے پر لکھیں یا کسی کتب فروش سے حاصل کریں

قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

ابوالکلام قاسمی

نذیر احمد کے ناولوں میں بیانیہ اور منشائے مصنّف کے مسائل

نذیر احمد کے ناول، ان کے موضوعات اور کرداروں کی نوعیت کے بارے میں جو تنقیدی تصوّرات یا مفروضات مقبول رہے ہیں، ان میں سب سے اہم تصوّر یا مفروضہ ان ناولوں کا تمثیلی قصّہ قرار دیا جانا ہے، اسی مناسبت سے تمثیلی قصّے کے بطن سے پھوٹنے والے دوسرے مضمرات اپنے آپ ان ناولوں کے موضوعات اور کرداروں پر منطبق کیے گئے اور بالعموم وہی نتائج نکالے گئے جو ان ناولوں کو تمثیل نگاری کے زمرے میں شامل کرنے کی توثیق کر سکتے ہوں۔ ان ناولوں کے بارے میں بعض تحریریں البتّہ اس حاوی تنقیدی نقطۂ نظر سے الگ ہو کر لکھی گئیں، ان میں ایک احتشام حسین کا مضمون ہے، دوسرا چودھری محمد نعیم کا اور تیسری طرح کی تحریروں میں وہ مضامین آتے ہیں جن میں نذیر احمد کے بعض کرداروں کو عہدِ جدید میں رونما ہونے والے بعض انقلابی تصوّرات اور رویّوں کے نمائندے کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نذیر احمد کے ناول، ناول بھی ہیں یا نہیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلا لبرل اندازِ نظر احتشام حسین نے یہ لکھ کر اختیار کیا تھا کہ "ناول کی ہیئت کی لچک، موضوعات کی آزادی اسالیب کا تنوع تکنیک کی رنگارنگی، ناول کی صورت کے متعلق کسی حرفِ آخر کے اعلان کی اجازت نہیں دیتے"۔ اردو میں صنفی حد بندیوں کے سلسلے میں اتنا لچک دار رویّہ دیکھنے کو کم ملتا ہے۔ لیکن اگر صنفی اختلاف کی ضمنی حد بندیوں پر اصرار نہ کیا جائے تو بالکل نئے ادبی تصوّرات میں بھی صنفی سطح کی بڑی تقسیم کے تحت نثری بیانیہ کے ایک اہم اور قابلِ مطالعہ نمونے کے طور پر نذیر احمد کے ناولوں کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا، اور اگر انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے تو نثر تو نثر خود اردو ناول کی تاریخ کے ساتھ بھی انصاف

نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ برِ صغیر کی تہذیبی صورت حال کے اظہار کی حیثیت سے بھی نذیر احمد کے ناول غیر معمولی بیانیہ کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ویسے اِدھر ماضی قریب میں ادبی نظریات کے عالمی منظر نامے میں بھی ناول کو ایک آزاد فارم کے طور پر دیکھنے اور قبول کرنے کا نقطۂ نظر بھی نذیر احمد کے حق میں جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی ایک مثال میلان کنڈیرا کی اُس رائے میں دیکھی جا سکتی ہے جو اُس نے اِس سوال کے جواب میں دی تھی کہ "آخر وہ کیا چیز ہے، جو ناول کو ناول بناتی ہے اور جو ناول نگار کی غیر معمولی آزادی کی حد بندی کرتی ہے؟" میلان کنڈیرا کا جواب تھا کہ:

> ناول نثر مرکّب کا ایک طویل ٹکڑا ہے جس کی بنیاد اختراع کردہ کرداروں سے تفریح بازی پر قائم ہے، بس اگر کچھ حد بندیاں ہیں تو یہی ہیں۔ مرکّب سے میرا منشا، ناول نگار کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے موضوع کو ہر طرف سے گرفت میں لے آئے۔ ایسی گرفت کہ تکمیل کا حق ادا ہو جائے۔ طنز سے پُر انشائیہ، خود نوشت کا کوئی ٹکڑا، کوئی تاریخی امر واقعہ، تخیل کی پرواز وغیرہ۔ ناول میں امتزاج کی جو بیکراں قدرت موجود ہے وہ ہر چیز کی شیرازہ بندی ایک کلّی وحدت میں کر سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح POLY PHONIC موسیقی میں مختلف آوازوں کو مدغم کر کے ایک آہنگ بنایا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی کتاب کی وحدت محض پلاٹ کے توسّط سے ہو۔ یہ موضوع سے بھی ہو سکتی ہے۔

اس پس منظر میں نذیر احمد کے ناولوں کو اردو ناول نگاری کے اہم نمونوں کا درجہ تو دیا ہی جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان ناولوں کو ایسے بیانیہ متن کی حیثیت سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان ناولوں کے بیانیہ کی قدر و قیمت اور اس میں راوی کے منصب یا مصنّف اور راوی کے رشتے کی نوعیت اور روّیے کا بھی تعین کیا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ناول اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے زیر اثر لکھے گئے تھے، اور یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ان ناولوں کے محرّک کے طور پر انگریزی سرکار کی تعلیمی پالیسی، انعام کا اشتیاق اور سرکاری طور پر انعام یافتہ قرار دیے جانے کے بعد ان کی اشاعت اور مقبولیت کے تیقّن کو بھی بڑی اہمیت حاصل رہی، اور منشائے مصنّف کے پس منظر میں کسی نہ کسی طرح یہ توقعات بھی ضرور کارفرما رہیں۔ نذیر احمد نے 'فسانۂ مبتلا'

کے دیباچے میں اس محرک کا اعتراف خود بھی کیا ہے:

"سر ولیم کی قدردانی مجھے تصنیف و تالیف کی باعث ہوئی۔ یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہو گیا۔ خانہ داری میں مرآۃ العروس معلومات ضروری میں بنات النعش، خدا پرستی میں توبۃ النصوح۔ ان کتابوں نے ایسا رواج پایا کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاکا، مرہٹی، پنجابی، کشمیری سات زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اس وقت تک بدفعات چالیس ہزار جلدیں چھپ چکیں"۔

اس صورت حال کے پس منظر کے طور پر چودھری محمد نعیم نے اپنے مضمون "نذیر احمد کا انعامی ادب" میں الہ آباد گورنمنٹ گزٹ، نوٹیفیکیشن ۱۸۶۸ء کے اعلان کا حوالہ دیتے ہوئے متذکرہ اشتہار کا ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے:

"ہرگاہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ صوبجات شمالی و مغربی کی زبان (کذا) میں تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی کے لیے عزت مآب جناب لفٹیننٹ گورنر صاحب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انعامات دیے جائیں گے۔ ورناکولر میں مفید کتابوں کی تیاری پر جو منظور شدہ انداز و اسلوب کی ہوں اور جن کا تعلق سائنس یا لٹریچر کی کسی بھی صنف سے ہو۔ ایسی کتاب طبع زاد تصنیف بھی ہو سکتی ہے اور تالیف اور ترجمہ بھی۔ الٰہیات (تھیالوجی) پر کتابیں نہیں قبول کی جائیں گی اور نہ ایسی کتاب جس میں اخلاقیات کے خلاف کوئی بات ہو"۔

چودھری محمد نعیم نے انعام کے اس اعلان کا ذکر کرنے کے بعد مزید لکھا ہے کہ:

"مرآۃ العروس ۶۶-۱۸۶۵ء میں شروع کی گئی تھی اور ۶۸-۱۸۶۷ء میں تکمیل کو پہنچی... انعام کے اعلان کے بعد یہ کتاب مقابلے میں پیش کی گئی اور پہلے ہی سال یعنی ۱۸۶۹ء میں اس پر نذیر احمد کو نہ صرف پورا انعام ایک ہزار روپے ملا بلکہ لفٹیننٹ گورنر کی طرف سے خصوصی قدر شناسی کے طور پر ایک گھڑی بھی ملی۔ اس کے علاوہ سرکار نے اپنے اداروں کے لیے اس کی دو ہزار کاپیاں خریدیں اور تعلیمی نصاب میں شمولیت کے لیے بھی حکم صادر ہوا۔ اس کا

انگریزی ترجمہ ۱۹۰۳ء میں لندن سے چھپا تھا۔"

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا 'مراۃ العروس' کے بعد 'بنات النعش' پر دوسرا اور 'توبۃ النصوح' پر پھر پہلا انعام ملتا ہے۔ یہ انعامی سلسلہ ایک ایسا محرک تھا جسے بادی النظر میں ان ناولوں کا محض پس منظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر جب اس انعامی محرک کو ناول نگار نذیر احمد کے مقصد و مدعا اور مصنّف کی حیثیت سے ان کے منشا کے ساتھ وابستہ کرکے دیکھا جائے گا تو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دینے والے ان ناولوں میں اپنے عہد کے تہذیبی انتشار، عقلیت اور تجربیت پسندی کے میلانات اور سماجی اور ثقافتی اصلاح کی کاوش کی بلند آہنگی غیر معمولی طور پر نمایاں ہے۔ اس لیے جس طرح ہم انگریزی حکومت کے انعامات کو منشائے مصنّف کے خارجی محرک کا نام دے سکتے ہیں، اسی طرح نذیر احمد کے لکچرز، بعض ناولوں کے دیباچوں اور مصنّف کے بعض بیانات سے بھی منشائے مصنّف کی تشکیل میں مدد لے سکتے ہیں، اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ اس نوع کے بیانات میں کیا کوئی ایسا سرا تلاش کیا جا سکتا ہے جو ان ناولوں کے متن میں داخلی طور پر رونما ہونے والے منشائے مصنّف اور راوی کی حیثیت سے ان کی ترجیحات تک ہماری رسائی کرائے۔ اور اگر ایسا ممکن ہے، تو بیانیہ میں کرداروں کی تخلیق، اور ان کی شخصیت کے ارتقاء کا عمل جگہ جگہ مصنّف کی مرضی اور کوشش کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کا ثبوت اپنے آپ مل جاتا ہے۔ مگر ایک اہم سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ متعدد مقامات پر کرداروں کا نمو اور ان کے عمل کا رخ مصنّف کے منشا کے برخلاف کیوں دکھائی دیتا ہے اور بار بار کردار، راوی کی گرفت سے آزاد کیوں ہو جاتے ہیں؟ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ منشائے مصنّف کو سامنے لانے کے دوسرے وسائل کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ آخر ناول کا بیانیہ مصنّف کے مقصد و مدعا سے کیوں کر متصادم ہے؟ نذیر احمد کے لکچرز کے علاوہ جو چیز ان کے ناولوں کے موضوعاتی پس منظر کو نمایاں کرتی ہے وہ ان کے ناولوں کے دیباچے ہیں، ناول نگاری کے فنّی لوازم اور ضوابط کے اعتبار سے نذیر احمد کے ابتدائی دو ناول مراۃ العروس اور بنات النعش، اور بعد کے ناول ابن الوقت، رویائے صادقہ اور ایامیٰ کو نسبتاً کم تر درجے کے ناول، قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن جب مصنّف کی ناول نگاری کو بحیثیتِ مجموعی ایک مکمل متن کی صورت میں دیکھا جائے گا

تو شاید توبۃ النصوح یا فسانۂ مبتلا اور باقی دوسرے ناولوں کی پرکھ کے لیے الگ الگ پیمانے مقرّر نہیں کیے جائیں گے۔ اس لیے آیئے یہ دیکھا جائے کہ نذیر احمد مراۃ العروس میں اپنے مدّعا کا ذکر کن الفاظ میں کرتے ہیں:

"میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دل افسردہ، ان کی طبیعتیں منغض اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں۔ تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ ان میں مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں، ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے، اور کسی دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اُکتائے طبیعت نہ گھبرائے، مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا پر نہ ملا تب میں نے اس قصّے کا منصوبہ باندھا۔"

اپنی دوسری کتاب 'بنات النعش' کے دیباچے میں مصنّف کی طرف سے اس مدّعا کی مزید وضاحت کی گئی ہے:

"یہ کتاب 'مراۃ العروس' کا گویا دوسرا حصّہ ہے۔ وہی بولی ہے، وہی طرز ہے۔ مراۃ العروس سے تعلیم اخلاق و خانہ داری مقصود تھی، اسی سے وہ بھی ہے مگر ضمناً، اور معلومات علی خالصۃً۔ تعلیم دین داری کا ایک مضمون اور رہ گیا ہے، اگر حیاتِ مستعار باقی ہے اور پیٹ کے دھندے یعنی مشاغلِ خدمت سے اتنی تھوڑی سی فرصت بھی ملتی رہے تو انشاء اللہ بشرط خیریت اگلے سال تک وہ بھی ایک کتاب کے پیرائے میں پیش کش ناظرین کیا جائے گا۔"

وہ ناول جس کی بشارت آخری جملے میں دی گئی ہے وہ 'توبۃ النصوح' ہے اور صحیح معنوں میں 'توبۃ النصوح' کا گہرا مطالعہ ہی منشائے مصنّف اور ناول کے بیانیہ کے رشتے کی نوعیت کو زیادہ واضح کر سکتا ہے۔ تاہم یہ دیکھ لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ 'مراۃ العروس' اور

'بنات النعش' میں اکبری اور اصغری کی کہانی کا متن کس طرح مصنف کے بلند بانگ اصلاحی لہجے کی تشکیل کے ساتھ ساتھ فنی طور پر اس کی لاتشکیل یا تردید کی صورت بھی سامنے لاتا ہے۔ اس موقع پر اگر ایک بار 'مراۃ العروس' کے آس پہلے باب کو یاد کر لیا جائے تو بہتر ہوگا جو ناول کی مرکزی کہانی کی حیثیت سے اس کا کوئی ناگزیر جزو تو نہیں لیکن جس باب کو مصنف نے اپنی تمہید یا عرض مدّعا کی توسیع بنا کر پیش کیا ہے۔ اس باب کے ابتدائی جملے میں نذیر احمد لکھتے ہیں کہ "غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا اپنا حال ہے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے، زندگی میں اس کو کیا کیا باتیں پیش آئیں اور کیوں کر اس کی حالت بدلا کرتی ہے"۔ یہ بیان مصنف کے مدّعا کو ظاہر کرنے کے بجائے کردار نگاری کے سلسلے میں ان کے فنی نقطۂ نظر کو زیادہ نمایاں کرتا ہے، اگر نذیر احمد نے اپنے بیانیہ میں کرداروں کی نمو پذیری کو فطری ارتقا اور غیر شعوری تبدیلیوں کے ساتھ پیش کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی ہوتی تو اکبری اور اصغری کے کردار ایسا التباس ہرگز نہ پیدا کر پاتے کہ لوگ انھیں نذیر احمد کے اصلاح پسند قلم کی تخلیقِ محض سمجھنے کے بجائے (بعض روایتوں کے مطابق) ان کے بتائے ہوئے پتے پر ان خواتین کے گھر کا پتہ پوچھتے پھریں۔ اکبری اور اصغری ہر چند کہ سگی بہنیں ہیں مگر دونوں کی کردار سازی کے لیے دو الگ الگ ماحول بنائے گئے ہیں۔ ایک کی تربیت نانی کے لاڈ پیار یا ناز برداری کے ماحول میں ہوتی ہے اور دوسری کی باپ اور ماں کے بنائے ہوئے حقیقت پسندانہ اور اصلاحی ماحول میں۔ اس لیے اگر اکبری پھوہڑ، بدسلیقہ اور بگڑے ہوئے عادات و اطوار کی مالک ہے تو اس کا جواز ناول میں موجود ہے اور اگر اصغری کی شخصیت میں ذہانت، دوراندیشی، حفظ مراتب اور حکمت عملی کی صفات پائی جاتی ہیں تو اس کا سبب اس کردار کا مثالی ہونا نہیں، بلکہ اس کا محرک والدین کا فراہم کردہ حقیقت پسندانہ ماحول اور مثبت تربیت بھی، متن کے اندر ہی موجود ہے۔ یعنی یہ کردار بھی بغیر جواز کے اپنے مخصوص وجود کا تعیّن نہیں کرتا ۔ محمودہ کا ماحول اصغری سے ملتا جلتا ہے تو اس کی اصلاح جلد ہو جاتی ہے اور اگر حسن آرا کا کردار اصغری کے زیرِ اثر تبدیل ہوتا ہے تو اس میں بھی داخلی اثر پذیری اور خارجی اثر اندازی کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسے اگر آپ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہیں تو کوئی غلط بات نہ

ہوگی کہ اگر ایک طرف کرداروں میں ماحول سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت اور اپنے آپ کو بدلنے کا میلان ہے تو ان کے اندر مثالی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں، مگر دوسری طرف اگر ان میں تبدیلی کی داخلی استعداد نہیں تو ان کا انجام منفی نکلتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ ہر صورت حال اور ہر کردار کے موازنے کے لیے کردار اور صورت حال کا تخالف اور تضاد بھی خود متن کے اندر موجود ہے۔ اکبری کی نشوونما کا پس منظر اس سے قطعاً مختلف ہے جو اصغری کا ہے۔ اصغری کے کردار کو نمایاں کرنے کی خاطر اکبری کا کردار موجود ہے، اور محمودہ کے جوہر کی قدر شناسی کے لیے حسن آرا کی شخصیت میں اپنے آپ ایک جواز فراہم ہو جاتا ہے۔ اس طرح اصغری کے کردار کو امتیاز اور مثالیت سے ہم کنار کرنے کے باوجود اکبری کے کردار کو جن منفی صفات کا حامل بتایا گیا ہے وہ صفات اکبری کو اس کی سسرال کے لیے کتنا ہی ناپسندیدہ بناتی ہوں لیکن ہمارے لیے ایک زندہ اور دلچسپ کردار بنائے رکھتی ہیں۔ اس کا شدید ردِّعمل، اس کی حیلہ جوئی اور شوہر اور ساس سے اس کا اختلاف اسے اصغری کے مقابلے میں زیادہ پرکشش اور حرکی بناتے ہیں ــــ اور چونکہ طرح طرح کی آویزشوں سے گزارنے کے باوجود اکبری کا انجام منفی نہیں دکھایا گیا اور اصغری کی حکمت عملی کے وسیلے سے ہی سہی اس کے انجام کو منطقی جواز کے ساتھ تبدیل کر کے پیش کیا گیا ہے، اس لیے اس کے معاملے میں ہماری ہمدردی بھی آخر آخر تک باقی رہتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ توفیقی اعتبار سے نذیر احمد کے ابتدائی نقوش ہیں۔ اگر آپ 'فسانہ مبتلا' میں اسی قسم کی تضاد آفرینی اور موازناتی بیانیہ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہریالی کا وہ کردار جس کو غیرت بیگم کے کردار کے محض پس منظر کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور مقصد و منشا یہ سامنے رکھا گیا ہے کہ غیرت بیگم کی بدمزاجی اور بدسلیقگی کا تضاد بھی متوازی طور پر واضح ہو جائے ــــ لیکن غیرت بیگم کے کردار کو نمایاں کرنے والا مصنّف اپنے مقصد کے معاملے میں چوکس اور چوکنا ہونے کے باوجود اپنے متن کے دام میں ایسا اسیر ہو جاتا ہے کہ اس کے منشا کے برخلاف ہریالی کا کردار زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے اور غیرت بیگم پس منظر میں چلی جاتی ہے ــــ ہریالی ایک طوائف ہے، مگر اس پیشے میں آنے کی مجبوری، اور اس کی تہذیب و شائستگی، اس کو مبتلا سے اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ وہ مبتلا کی منکوحہ بن جائے، اور پورے ناول پر چھا جائے۔ واضح رہے کہ یہ کردار اور اس کردار کے

وسیلے سے دوسری شادی کا جواز اس مصنف کے قلم کا تخلیق کردہ ہے جو تعددِ ازدواج کی مخالفت کے باعث اپنے معاشرے میں معتوب رہ چکا ہے ــــ اس طرح ہریالی کا کردار صرف داخلی طور پر رونما ہونے والے منشائے مصنف سے متصادم نہیں بلکہ ناول کے باہر مصنف کی ذاتی پسند و ناپسند اور ان کے معروف سماجی نقطۂ نظر کی بھی نفی کرتا ہے۔

'فسانۂ مبتلا' کے بیانیہ میں نذیر احمد کے اکثر ناولوں کی طرح واحد متکلم راوی کے بجائے حاضر راوی کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اکثر و بیشتر کرداروں کی پسند و ناپسند ہی پر نہیں بلکہ بیانیہ کے اسلوب اور لہجے پر بھی حاضر راوی کی چھاپ موجود ہے۔ جو اتفاق سے راوی سے کہیں زیادہ مصنف کا متبادل بھی نظر آتا ہے، مگر بیانیہ کے اندر کرداروں کے ساتھ داخلی مداخلت اور راوی کے قادرِ مطلق اور حاضرِ مطلق ہونے کا احساس دلانے کے باوجود متن کا خودکار عمل اپنا کام کرتا ہے، اور ان ساری بندشوں کے باوجود 'بیانیہ' مصنف یا راوی کے منشا کے برخلاف ہمیں بدلی ہوئی صورت حال سے دوچار کرتا ہے۔ اور اس طرح اردو کے ان اوّلین ناولوں میں بھی متعدد فنّی نقائص کے باوجود بیانیہ کے نقطۂ نظر سے توجہ اور مطالعے کے بہت سے پہلو پیدا ہو جاتے ہیں ــــ اس لیے اگر 'مراۃ العروس' کی تمہید کے ان الفاظ کو یاد رکھا جائے کہ "اگر آدمی اپنی حالت پر غور کرتا ہے تو اسے پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ دنیا میں جو باتیں پیش آتی ہیں وہ کس طرح اس کو اندر اور باہر سے تبدیل کرتی رہتی ہیں" تو پتہ چلتا ہے کہ نذیر احمد کے فنّی طور پر نسبتاً ناپختہ اور نامکمل ناولوں میں بھی مصنف کی خواہش اور کوشش اپنی جگہ مگر متن، مصنف کے منشا سے اپنا معروضی فاصلہ اپنے آپ پیدا کرتا ہے اور بیانیہ کے عمل میں منشائے مصنف کے برخلاف بسا اوقات کردار اپنی فطری نمو پذیری پر بھی اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں خود مصنف کیا رول ادا کرتا ہے؟ یا اس کا یہ رول کارگر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کی جستجو نذیر احمد کے ممتاز ناولوں کے ساتھ نسبتاً کمزور ناولوں تک کے حوالے سے بھی کی جا سکتی ہے۔ بمثال کے طور پر 'رویائے صادقہ' میں صادقہ کے کردار میں ایک ایسی وجدانی صلاحیت کی موجودگی دکھائی گئی ہے جو خواب کے وسیلے سے خرقِ عادت تک کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس ناول کے آغاز میں بھی راوی کے متکلم ہونے کے باوجود 'بیانیہ' اپنا جو انداز اختیار کرتا ہے اس کو معروضی اسلوب کے کامیاب نمونے کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

ناول کی ابتدا اور صادقہ کے کردار کا تعارف آپ بھی ملاحظہ کیجیے :

"لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم، کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور اصلی ایک بھی نہیں۔ اس کو میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی خطاب ملا۔"

ان جملوں میں اپنے کردار کی تمثیلی صفات کے تعیّن کے باوجود، اس قدر حقیقت پسندانہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ التباسِ حقیقت، اظہارِ حقیقت کا نعم البدل بن گیا ہے جب کہ نہ تو یہ کردار اپنا کوئی خارجی وجود رکھتا ہے، نہ اس کے نام کے سلسلے میں تحقیق کی بات اپنی کوئی بنیاد رکھتی ہے اور نہ متکلم راوی، کردار کے ساتھ سوائے التباس کی تخلیق کے کوئی اور تعلق رکھتا ہے۔ 'رویائے صادقہ' کے مرکزی کردار کی اس مثالیت کے باوجود اس ناول کے نسوانی کردار، مراۃ العروس، بنات النعش، 'فسانۂ مبتلا' اور ایامیٰ کے کرداروں ہی کی طرح نہایت متحرک اور فعال ہیں۔ ان ناولوں میں نذیر احمد کے نسوانی کرداروں کا مردوں کے مقابلے میں زیادہ لائق، زیادہ حوصلہ مند، اور زیادہ حرکی ہونا نہ صرف بیانیہ میں کرداروں کے رول کا اثبات کرتا ہے بلکہ ان ناولوں کے موضوع یعنی خواتین کی تعلیمی اور سماجی اصلاح سے بھی بھرپور طریقے پر ہم آہنگ ہے۔ ان نسوانی کرداروں کے مطالعے کے دوران یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کردار سماجی اور تہذیبی طور پر مسلمانوں کے دم گھٹنے والے پس ماندہ سماج کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ نئی تہذیب و شائستگی کے مغربی تصوّر کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں۔ ان ناولوں میں مذہب اسلام کی تعلیمات سے مصنف کی جذباتی وابستگی اپنی جگہ، مگر اس کے ساتھ ہی اس وسیع القلبی کا بھی اظہار ملتا ہے جو تہذیب اور اخلاقیات کے اس فیضان کی بھی نفی نہیں کرتا جو اہلِ کتاب انگریزوں (عیسائیوں) کے توسط سے ہندوستان والوں کو میسّر آ رہا تھا۔ یہ نسوانی کردار مذہبی حد بندیوں میں اسیر رہتے ہوئے اچھے سماج اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مردوں کے برابر ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی کارکردگی انقلابی طور پر مردوں سے زیادہ موثر اور زیادہ

کارآمد دکھائی گئی ہے، اور جہاں کہیں نسوانی کرداروں کی بالادستی نہیں ملتی وہاں بھی ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں ان کا عمل دخل برابر کا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ابن الوقت اور توبۃ النصوح کی مثالوں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

توبۃ النصوح کو نذیر احمد کے ناولوں میں فنی اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے، اور اب منشائے مصنف کے پس منظر میں اگر کسی ناول کے متن کو بعض نقادوں نے زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے تو وہ توبۃ النصوح کا ہی متن ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی جس بات کو سب سے زیادہ نمایاں اور بلند آہنگ بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے وہ محض کلیم کا کردار ہے۔ حالانکہ کلیم کے کردار کو بعض اور پہلوؤں سے بھی دیکھے جانے کی گنجائش باقی ہے اور اس کردار کے علاوہ بھی بعض دوسرے کردار، صورت حال اور کردار نگاری کی سطح پر موازنے اور تضاد یا پیراڈاکس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم توبۃ النصوح کے بعض نمائندہ کرداروں کے طرز وجود اور ناول کے واقعات کی ترتیب میں تضاد یا تخالف کی تکنیک کے ذریعہ صورت حال یا کرداروں کو نمایاں کرنے کی مثالوں پر غور کریں، زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ توبۃ النصوح جیسا ناول لکھنے کے پیچھے نذیر احمد کا کون سا مقصد کارفرما ہے۔ یہ مقصد و مدعا ناول کے متن میں جس طرح دانستہ یا غیر دانستہ طور پر رونما ہوا ہے اس کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ سردست اس خارجی حوالے سے مدد لی جا سکتی ہے جسے دیباچے کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

> "اس کتاب کی تصنیف کرنے سے مقصد اصلی یہ ہے کہ اس فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقع ہو رہی ہے، اس کی اصلاح ہو اور ان کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ تربیت اولاد صرف اسی کا نام نہیں کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کر دیا... بلکہ ان کے اخلاق کی تہذیب، ان کے مزاج کی اصلاح، ان کی عادات کی درستی، ان کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے۔ کوئی شخص تربیت اولاد کے فرض کو پورا پورا ادا نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ خود اپنی شائستگی کا نمونہ ان کو نہیں دکھاتا اور اولاد کے ساتھ اپنا برتاؤ محتسبانہ طور پر نہیں رکھتا... اس کتاب میں یہ خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اس طرح کی غلطیوں پر لوگوں کو تنبیہہ ہو۔ یہ کتاب لوگوں کو اس بات کا بھی اچھی

طرح یقین کرا دے گی کہ تربیت اولاد ایک فرض موقف ہے۔ یعنی لڑکے جب
تک کم سن ہیں تربیت پذیر ہیں، اور بڑے ہوئے پیچھے ان کی اصلاح مشکل یا
متعذر بلکہ محال ہو جاتی ہے۔"

اپنے اس دیباچے میں نذیر احمد نے تہذیب اور اخلاق کے پیچھے مذہب کے رول پر بھی اصرار کیا ہے اور دوسرے مذاہب کی اعلیٰ قدروں اور مطلق اقدار کی ہمہ گیری کو بھی تسلیم کیا ہے، اور اس طرح توبۃ النصوح' میں نصوح کی مذہبیت اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے کرداروں کا جواز فراہم کر دیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ اولاد کی تربیت کے لیے والدین کے احتساب کے معاملے کو، جس کی وضاحت دیباچے میں ہی کر دی گئی ہے، اس کے عملی مصداق کے طور پر نصوح کے محتسبانہ روّیے ہمیں ناول کے متن میں بہت زیادہ غیر متوقع اور خارجی طور پر مسلط کیے ہوئے نظر نہیں آتے۔ گویا کہ اس ناول کا دیباچہ پورے ناول کے متن میں اختیار کیے جانے والے فکری اور موضوعاتی رویے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اگر یہ سمجھا جائے کہ توبۃ النصوح' میں منشائے مصنّف کی تفہیم کا سب سے کارآمد وسیلہ اس ناول کے تمہیدی کلمات ہی ہیں تو کوئی نامناسب بات نہ ہوگی۔ چنانچہ توبۃ النصوح کے مطالعہ کے سلسلے میں اب تک کی تنقیدی آرا میں بنیادی حوالے کے طور پر نذیر احمد کے اسی موقّف کو استعمال کیا گیا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اس خارجی موقّف کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ ناول کے متن میں اُبھرنے والا منشائے مصنّف بڑی حد تک نظر انداز ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس بات پر بھی توجّہ صرف کرنے کی ضرورت تھی کہ کلیم اور نعیمہ کے کرداروں کا بنیادی رجحان کیا ہے، اور کیا ان دونوں کرداروں کو منفی طور پر پیش کر کے راوی کسی خاص طرح کی تبدیلی یا انقلاب سے ان کرداروں کو دوچار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بھی دیکھنے کی ضرورت تھی کہ نذیر احمد کے معتوب اور ناپسندیدہ کردار ناول کی پوری ساخت میں کیوں کر اپنا غلبہ اور تسلّط برقرار رکھتے ہیں؟ مثلاً یہ کوئی غیر اہم بات نہیں کہ مذہب کو اخلاقیات کی ریڑھ کی ہڈی قرار دینے والے مصنّف نے نعیمہ کی زبان سے اس رائے کا اظہار کیوں کر کرایا کہ مذہب کے غیر معمولی عمل دخل اور ہر وقت نماز روزہ پہ اصرار کے باعث گھر کا ماحول کس طرح دگرگوں ہو کر رہ گیا ہے۔ نعیمہ کی اصلاح کے لیے جب اس کی خالہ زاد بہن بلائی جاتی ہے تو وہ اس سے اپنے دل کا حال اس طرح بیان کرتی ہے:

"جب سے نماز روزے کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ہے، بھلمنساہٹ اور شرافت گئی گزری ہوئی۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر سب کا رنگ ڈھنگ دیکھنا۔ نہ وہ زمین رہی نہ وہ آسمان۔ گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل سا گیا ہے۔ نہ وہ ہنسی ہے نہ وہ دل لگی ہے، نہ وہ چرچے ہیں نہ وہ مذاق ہے نہ وہ چہچہے ہیں۔ گھر میں ایک اداسی سی چھائی رہتی ہے، ورنہ ابھی ایک مہینے کا مذکور ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہا کرتی تھیں۔ اب تو کوئی گھر میں آکر تھوکتا بھی نہیں۔"

اس مطالعے میں فطری صورت حال اور انسان کی فطری امنگوں سے مذہب کی لاتعلقی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ اپنے آپ میں مصنف کے اس نقطۂ نظر کی نفی کرتا ہے جس کے تحت وہ مذہب کو انسانی کردار کی تشکیل کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نعیمہ کی زبان سے ادا ہونے والا یہ بیان اس مخصوص عادات و اطوار کی خاتون کے فطری ردعمل اور غیر مشروط رویّے کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں، اور یہ ردِّعمل مذہبی مسلّمات کے شکنجے میں کسے ہوئے ناول کے متن کی گرفت سے باہر ہے۔ ناول کے متن میں اس نوع کے بیانات خواہ وہ کلیم کے مکالمے میں سامنے آئے ہوں یا نعیمہ کی زبان سے سرزد ہوئے ہوں، کم از کم اس بات کی تصدیق تو کر ہی دیتے ہیں کہ ایک سخت گیر مصنف ایسے تمام مقامات پر مصلحانہ شخصیت کو بالائے طاق رکھ کر کردار کی فطری نمو پذیری اور انسانی نفسیات کے بہاؤ کا محض تماشائی بن کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح کلیم کے کردار کے معاملے میں جن رجحانات کو کلیم کی روشن خیالی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ روشن خیالی سے کہیں زیادہ ایک خاص طرح کی تہذیبی مراجعت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ذرا کلیم کو جاگیردارانہ ماحول کی بے عملی، سہل پسندی اور خود مرکزیت کے پس منظر میں لے جا کر دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورت حال میں اگر مسلمانوں کا معاشرہ کسی تصادم کا شکار تھا تو وہ سیدھی سادی روشن خیالی اور رجعت پسندی کا تصادم نہیں تھا بلکہ آج کے مقابلے میں سرسید اور نذیر احمد کا معاصر ماحول ایک ایسی کش مکش سے دوچار تھا جس میں رجعت پسندی کے معنی جاگیردارانہ سہل پسندی یا بے عملی کے تھے اور اس وقت کی روشن خیالی مغرب کی لائی ہوئی تہذیب، زبان اور رویّوں کی تقلید سے عبارت تھی،

اور جہاں تک کلیم کے مقلد ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہے، تو اس کے بارے میں توبۃ النصوح میں کہانی کا راوی بھی ہمارے زمانے کے نقادوں سے بہت پہلے اشارے کر چکا تھا کہ "اگر کلیم بچ جاتا تو وہ نیکی اور دینداری میں اپنے سب بھائی بہنوں پر سبقت لے جاتا، اس نے مصیبتیں اٹھا کر اپنی رائے کو بدلا تھا، اور آفتیں جھیل کر تنبہ حاصل کیا تھا۔ پس وہ مجتہد تھا اور دوسرے مقلد۔ وہ محقق تھا اور دوسرے ناقل"۔۔۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ راوی کی یہ رائے توبۃ النصوح میں کردار نگاری کے ایک اور پہلو کو روشن کرتی ہے کہ اس ناول کا لکھنے والا المیہ کے کردار کو اس کے منطقی انجام تک لے جانے اور اجتہادی فیصلوں کے معاملے میں اس کو دیر تک موقع اور مہلت دینے کے راز سے واقف ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ تو کلیم اور نصوح کے رویوں کا تصادم ہی نمایاں کیا جا سکتا تھا اور نہ تناؤ اور کشمکش کی فضا کو طول دے کر ڈرامائی کیفیت ہی پیدا کی جا سکتی تھی۔ کلیم کے کردار کے غیر مقلدانہ انداز اور اس کے اجتہاد کو ہم جو بھی نام دیں مگر راوی کے محولہ بالا بیان کے باوجود اس بات کو فراموش کرنا آسان نہیں کہ نذیر احمد کی معاصر صورت حال میں انگریزی تہذیب کی جن برکتوں کو اس زمانے کے فیشن کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس کے شیدائیوں میں نذیر احمد کے ساتھ سرسید بھی تھے اور الطاف حسین حالی بھی۔ اور اگر جاگیردارانہ اقدار و روایات پر مستقل مزاجی کے ساتھ جمے رہنے کا نام روشن خیالی ہے تو نہ تو سرسید روشن خیال ٹھہرتے ہیں اور نہ ان کی تحریک سے وابستہ دوسرے دانش ور۔ نصوح درحقیقت اس رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ مذہب کو سرسید کی طرح عقلیت پسندی اور فطرت پسندی کے آئینے سے نہیں دیکھتا بس مذہب کو نظم و ضبط کی علامت اور توشۂ آخرت سمجھنے کے ساتھ بے عملی اور سہل پسندی کو ناپسند کرتا ہے اور شعر و ادب کو سامانِ تعیش کے طور پر استعمال کرنے کا مخالف بن کر سامنے آتا ہے۔ اور جہاں تک اس طرزِ فکر کا سوال ہے تو یہ بھی ہمارے لیے کوئی اجنبی اندازِ فکر نہیں۔ اس لیے کہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کی نظم جدید کی تحریک اور شاعری کے غزلیہ اور ہجویہ سرمایے کے بڑے حصے پر خطِ تنسیخ کھینچنے کا پورا رویّہ اسی طرزِ فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے کلیم کے کردار میں جس نوع کی سہل پسندی اور بے عملی کی نمود نصوح کے لیے اسے معرضِ خطر میں ڈالتی ہے، اس کو محض روشن خیالی کا سہرا کلیم کے

سر پر باندھ کر نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ اس کردار کی تفہیم کے لیے تہذیبی اور تاریخی سیاق و سباق کو بھی اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس لمبی بحث کے بعد ہم اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اہل کتاب کی طرف نذیر احمد کا روّیہ ہمدردانہ ہے اور تہذیب، زبان اور مذہبی اقدار کے معاملے میں وہ اہل کتاب یا انگریزوں کو مخاصمانہ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ایک عیسائی عورت اچھے اخلاق کی تعلیم دیتی ہے تو وہ ناول کے راوی کے لیے پسندیدہ بن جاتی ہے، انگریزوں کی طرح کی ضابطے اور اصول کی زندگی راوی کی واضح ترجیح ہے۔ ناول میں مختلف مذاہب کے حوالے سے اعلیٰ اقدار پر ہر جگہ اصرار ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تہذیب کو اگر رلوی اقدار کے آفاقی تصوّر سے وابستہ کر کے دیکھتا ہے تو یہ کوئی ایسی رجعت پسندی نہیں، اس لیے کہ نذیر احمد کے گردو پیش میں اس وقت کے سارے روشن خیال دانش ور نہ صرف انگریزی تہذیب کے دل دادہ نظر آتے ہیں بلکہ شعر و ادب کے معاملے میں انگریزی شاعری کے ترجموں اور انگریزی میں رائج اصناف سخن کی تقلید کا رجحان اتنا غالب ہے کہ نذیر احمد تو نذیر احمد جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ محمد حسین آزاد سے لے کر حالی، عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی تک اپنی مقبول ترین صنف غزل کو از کار رفتہ قرار دینے کا عملی ثبوت فراہم کرنے میں مصروف ہیں۔ اس پس منظر میں اگر آپ آصف فرخی کی مندرجہ ذیل رائے کو دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ کلیم اور نصوح کے درمیان پائے جانے والے اختلاف یا نسلی خلیج کو وہ عجلت میں رجعت پسندی اور روشن خیالی کی جنگ کا نام دے دیتے ہیں۔ وہ کلیم کا ایک مکالمہ نقل کرنے کے بعد رائے دیتے ہیں کہ:

> "کلیم کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی رجحان کو ملائیت اور ملائیت کو کس قدر نا قابلِ برداشت روّیہ سمجھا جا رہا ہے۔ کلیم اپنے زمانے کا لبرل ہے اور اس کے خیالات اس طبقے کے آئینہ دار۔ اور یہ روّیہ کلیم کا ہی نہیں، آج کے کسی بھی لبرل دانش ور کا ہو سکتا ہے۔ کلیم کی اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی راسخ الاعتقادی ORTHODOXY اور FUNDAMENTALISM کا ایک بڑا واشگاف تضاد اس ثقافت سے ہے، چاہے آپ اسے DECADENT ہی کہہ لیں، جو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں ارتقا پذیر ہوئی۔ کلیم اپنے عہد کا انتہائی مہذّب اور CULTURED نمائندہ ہے۔ اس کا مسئلہ اٹھتا ہی

اس لیے ہے کہ وہ ایک مخصوص طرزِ معاشرت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔
اور وہ انداز اس کے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اس کو باپ کی نصیحت
پر بدل نہیں سکتا۔ کلیم اور نصوح کا یہ تصادم دراصل ہندوستانی مسلمانوں
کے اجتماعی کردار کی دو انتہاؤں کا تصادم ہے۔ مسلمانوں کے قومی شخص میں نصوح
بھی مضمر ہے اور کلیم بھی پنہاں ہے۔" (سوغات ۲، ص ۲۷۱۔)

اس بیان میں راسخ الاعتقادی اور بنیاد پرستی کا جو تصادم دکھلایا گیا ہے وہ بقول مصنف لبرل اندازِ فکر سے ہے، مگر اس کی تردید خود متذکرہ اقتباس میں "چاہے اسے آپ DECADENT ہی کہہ لیں" کے الفاظ سے مصنف نے اپنے آپ کر دی ہے۔ اس موقع پر شاید یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ کلیم کا زوال آمادہ رجحان بنیاد پرستی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرناک اور رجعت پرستانہ ہے اس لیے اس کا رشتہ کسی بھی طرح آج کی لبرل دانش وری سے تلاش کرنا نہ موزوں ہے اور نہ درست ۔۔۔ البتہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کلیم کے کردار کی صلاحیت، ثابت قدمی، اور اس کا ذہنی اور جذباتی اضطراب، ناول کے بیانیہ میں اس کردار کو المیہ کے ہیرو جیسی اہمیت عطا کر دیتا ہے۔ نعیمہ اور کلیم کے علاوہ بعض دوسرے ضمنی کردار بھی منشائے مصنف کے سیاق و سباق میں منفی ہو کر زیادہ فعّال اور زیادہ دلچسپ بن جاتے ہیں۔ مرزا ظاہردار بیگ اور فطرت کے کردار اپنے اپنے ناموں کی مناسبت سے تمثیلی ہونے کے ساتھ اپنی مخصوص شناخت لے کر نمودار ہوتے ہیں اور زمانی طور پر بہت تھوڑے سے وقت کے لیے اپنا عمل دخل دکھانے کے باوجود اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ناقابلِ فراموش بن جاتے ہیں۔ 'توبۃ النصوح' میں تقریباً ہر کردار کی شناخت کے لیے متوازی طور پر کوئی ایسا دوسرا کردار ضرور موجود ہے جو تضاد یا تخالف کے ذریعے اس کردار کی صفات اور رویّوں کو زیادہ نمایاں کر سکے۔ نعیمہ کے ساتھ حمیدہ، کلیم کے ساتھ اس کا بھائی سلیم، نصوح کے گھر کے ماحول کے ساتھ کلیم کی خالہ کے گھر کا متوازن اور معتدل ماحول، کلیم کے کمرے کے آرام و آسائش کے مقابلے میں مسجد کا فرش اور ظاہردار بیگ کی ظاہرداری، غرض یہ کہ اکثر کردار اور صورت حال کو نمایاں کرنے کی کوئی نہ کوئی فنّی تدبیر ناول میں موجود ہے۔ اس فنّی طریقِ کار میں نذیر احمد کی تدبیر کاری کو شعوری طور پر کتنا دخل ہے؟ اس کا کوئی ثبوت ظاہری شواہد سے تو نہیں ملتا، مگر اپنے ناولوں

کے دیباچوں میں سرتاپا اصلاح پسند اور مقصدیت کا علم بردار نظر آنے کے باوجود نذیر احمد کا بیانیہ اتنا طاقت ور ہے کہ اس کے دائرۂ کار میں وہ ساری تدبیر کاری اپنے آپ شامل ہوتی چلی جاتی ہے جس کی توقع کرنا بھی اردو ناول نگاری کے نقطۂ آغاز پر زیادتی کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کے ناولوں میں ان کا منشا اور مدّعا خارجی طور پر ناول کے متن کو اپنی گرفت میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کرداروں اور واقعات کے انتخاب میں بھی مصنّف کی ترجیحات کسی نہ کسی طرح اپنی جھلکیاں ضرور دکھلاتی ہیں، مگر اصلاح پسند نذیر احمد کے ساتھ فن کار نذیر احمد ہر جگہ متصادم بھی دکھائی دیتا ہے۔ توبۃ النصوح کا شمار تو ان کے ممتاز ترین کارناموں میں ہوتا ہے۔ ان کے ایسے ناول بھی جن کو بہت امتیازی حیثیت نہیں دی جاتی، منشائے مصنّف کے برخلاف بعض کرداروں کی فطری نمو پذیری کے لیے اپنا جواز آپ فراہم کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنّف کے منشا کے کئی حوالوں کی موجودگی کے باوجود نذیر احمد کے آخری دَور کی ناول نگاری کا فنّی عمل خصوصیت کے ساتھ خود کار ہے۔ اور اگر نذیر احمد کے ناولوں کو صرف ان کے بیانیہ کی قوت اور متن کے امتیاز کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو دوسرے فنّی لوازم کے ساتھ ساتھ ان کی ناول نگاری کا یہ پہلو بھی صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ان کی قدر و منزلت متعیّن کرتا ہے۔ نذیر احمد کے مطالعہ کا ایک نیا اور مختلف سیاق و سباق بھی فراہم کرتا ہے۔

National Council for Promotion of Urdu Language
ACC No. 518 74 B
15/1/08
* New Delhi

شکیل الرحمٰن

ہیر وارث شاہ : ایک نیا تعارف

جب بابا بُلّھے شاہ پر مضمون لکھ رہا تھا تو اُن کے کلام میں ہیر رانجھا کا ذکر ملا تھا، یہ بات اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ بابا بُلّھے شاہ وارث شاہ کے معاصرین میں تھے اور اُن کا انتقال ہیر وارث شاہ کی تخلیق سے کوئی نو سال قبل ہوا تھا۔ بابا نے ہیر اور رانجھے دونوں کو استعاروں کے طور استعمال کیا ہے۔ اپنی ایک کافی میں کہتے ہیں:

ہیر رانجھا وے ہوگئے میلے
بھلّی ہیر ڈھونڈیڈی بیلے
رانجھا یار بغل وچ کھیلے
مینوں سدھ بدھ رہی ناسار

یعنی ہیر رانجھے کو تلاش کرتی بہت دور نکل گئی اور رانجھا اُس کے پاس ہی نکلا، دونوں کا ملن ہو گیا، میری سدھ بدھ جاتی رہی، میں کب ہوش میں تھا۔

بابا بُلّھے شاہ کی مشہور 'کافی' ہے "رانجھا جو گیڑا بن آیانی" (رانجھا یوگی بن کر آگیا ہے) بہت ہی خوب صورت اور دلفریب نغمہ ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

اس جوگی دی کی وے نشانی
کن وِچ مندراں گل وِچ گانی
اُس الفوں احد بنا یانی
رانجھا جو گیڑا بن آیانی
رانجھا جوگی تے میر جگیانی
اُس دی خاطر بھر سا پانی
ایویں تہ پچھلی عمر وہانی
اُس ہُن مینوں برما یانی
رانجھا جو گیڑا بن آیانی
بلہا شاہ دی ہن گت پائی

پیت پرانی مڑ مچائی
ایہہ گل کیکر چھپے چھپائی
ہن تخت ہزاریوں دھائی
رانجھا جوگیڑا بن آیائی!

یعنی اس یوگی کی نشانی یہ ہے کہ اس کے کانوں میں بالیاں ہیں اور گردن میں ایک رنگین فیتہ ہے، یوسف ثانی دکھائی دیتا ہے، اس نے 'الف' بن کر 'احد' کی تخلیق کی ہے، رانجھا جو یوگی کی صورت سامنے آیا ہے واقعی ایک یوگی ہے اور میں اُس کی جوگن ہوں، میرا ماضی بیکار تھا، اب میں اُس کی جی بھر خدمت کروں گی۔ رانجھا نے مجھے پیار دیا، بُلھا کہتا ہے اس نے محبوب کو پہچان لیا ہے، وہ عشق جو ذات کے اندر وجود کے اندر چھپا ہوا تھا پھر جاگ پڑا ہے، اس سچائی کو بھلا کوئی کس طرح چھپا سکتا ہے!

بابا بُلھے شاہ نے ہیر اور رانجھے کے استعاروں کو اعلا، اور افضل روحانی سطح عطا کی ہے۔ رانجھا میں معبود حقیقی اور حسنِ حقیقی کو دیکھا ہے اور اپنی ذات اپنے وجود کو ہیر تصور کیا ہے۔ ایمائی نکتہ آفرینی بابا کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ہے، کافیوں کے مطالعے سے اس کی معنی خیزی کا اندازہ ہوتا ہے، خالق اور مخلوق کے گہرے وجدانی رشتے کا تاثر ملتا رہتا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی عرض کر رہا ہوں کہ ہیر رانجھے کی ایسی کہانیاں بھی سینہ بہ سینہ چلتی رہی ہیں کہ جن میں تصوف کے فقر اور روحانی عشق اور شوق کے محاکات کو اہمیت دی گئی ہے، دونوں کردار جمالِ الٰہی کے مظہر بنے رہے ہیں، فارسی شاعر باقی کولابی نے اس عشقیہ فسانے کو منظوم کیا[1] آخری حصہ کچھ کو اس طرح ہے کہ ہیر رانجھا کے ساتھ جنگل کی جانب چلی گئی جہاں رانجھا بیمار ہو کر مر گیا، ہیر نے بھی اپنی موت کی دعا کی، رانجھا کی قبر پھٹی اور وہ اس کے اندر سما گئی۔ قیاس یہ ہے کہ باقی کولابی کے بعد بھی بعض لوگوں نے ہیر رانجھا کے قصے کو پیش کیا ہو گا۔ شاہ جہاں کے دور کے ایک شاعر سعید سعیدی نے "مثنوی افسانہ دلپذیر" یہ قصہ لکھا ہے چنابی کا قصہ "ہیر وماہی" بھی ملتا ہے۔ ایک شاعر تھے فقیر اللہ آفریں انھوں نے اپنے قصے میں رانجھا کو تخت ہزارے میں دفن کیا ہے اور ہیر کو جھنگ میں، ان کے مقبروں کو زیارت گاہوں کی صورت دے دی ہے، کچھ لوگوں نے ہیر رانجھا کو مکہ مدینہ بھیج دیا۔ اب

(1) کہا جاتا ہے ہیر رانجھا کی سب سے قدیم داستان دمودر اروڑا کھتری کی ہے جو عہد اکبری میں تھا۔ یہ داستان ملتانی پنجابی میں ہے، اس کا ایک نسخہ عجائب خانہ ملی کراچی میں ہے۔ افسانہ دلپذیر (ہیر ورانجھا) کا ایک مخطوطہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں ہے) دیکھیے پنجابی قصے فارسی زبان میں از ڈاکٹر محمد باقر لاہور (1960)

تک کی تحقیق یہ ہے کہ ہیر رانجھے کی داستان اکبر کے عہد میں نظم ہوئی فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں میں، بلاشبہ یہ قصہ لوک کہانی پر مبنی ہے، کہانی سینہ بہ سینہ چلتی رہی، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح، نئے مرکزی کردار بھی شامل ہوئے ہیں اور ضمنی کرداروں میں بھی اضافہ ہوا ہے، واقعات بھی بدلتے رہے ہیں، مگر کہانی کا مزاج ایک رہا ہے، اہل عرفان نے جس طرح لیلیٰ مجنوں کو دیکھا اُسی طرح بابا بلھے شاہ اور حضرت شاہ حسین نے ہیر رانجھا کو دیکھا۔

'ہیر وارث' کے مطابق یہ تخلیق دوستوں کی فرمائش پر 1180ھ (1823ء) میں وجود میں آئی، یہ منظوم داستان ساہی وال میں لکھی گئی جو ملتان کے علاقے میں ہے، وارث شاہ نے اُس دور کے حالات پر اشاروں میں اظہار خیال کیا ہے لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ 'ہیر وارث' کے شاعر کے تعلق سے ہمیں کوئی خبر نہیں ملتی، وارث شاہ لکھتے ہیں کہ علاقے کے حالات خراب تھے، اچھی اور عمدہ قدریں شکستہ ہو رہی تھیں، زمیندار بڑی بڑی زمینوں پر قابض تھے اور غریبوں اور کسانوں کا استحصال کر رہے تھے انھوں نے کہا ہے چور اُچکے چودھری بنے ہوئے تھے، ان حالات میں وہ تنہائی میں بیٹھے ہیر رانجھا کے قصے کو منظوم کر رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ملکا کھرل ہانس ایک مقام ہے کہ جہاں اُنھوں نے ہیر کے اشعار کہے، اگرچہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں شعراء میرے کلام کی سچائی کسوٹی پر پرکھ لیں "میں نے یہ گھوڑا منڈی میں گھما پھرا کر دکھادیا ہے" اور اُن کے قصے اور کلام کی خوشبو دور دور تک پھیلے گی، نوجوان جمالیاتی انبساط پائیں گے پھر بھی انھیں شرم آتی ہے کہ ان کے کلام میں جانے کتنے نقص ہیں، لوگ کیا کہیں گے، کہیں یہ دور کا ڈھول تو ثابت نہ ہوگا جو دور سے بھلا لگتا ہے اور اندر سے خالی ہوتی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے ڈھول کی سہانی آواز نے صدیوں لوگوں کو اپنی گرفت میں رکھا اور لوگوں نے دُرِ شہوار کی طرح اسے عزیز جانا، وارث شاہ نے اسے تمثیل کہا ہے اور امید کی ہے کہ لوگ اس تمثیل کے رموز سے متاثر ہوں گے، قصے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ جنسری ہوش اور جاگرتی کا آہنگ ہے، سہتی موت ہے، رانجھا جسم ہے، بھابی شہوت ہے، ربیل باندی، بھوک، کوئی اشارہ قبر سے دوزخ کے سفر کا ہے اور کوئی ماں کے شکم کا کہ جس میں انسان جانے کتنے لمحے بسر کر چکا ہے، پانچ درویش پانچ حواس ہیں، قاضی سچائی ہے اور تجمیل اعمال!!

'ہیر وارث شاہ' کی ابتدا، حمد، نعت، چاریار کی تعریف (حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ،

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) پیرانِ پیر کی مدح اور بابا فرید شکر گنج کی مدح سے ہوتی ہے۔ وارث شاہ کہتے ہیں میرے اشعار کی خوش نما اور مستحکم ترتیب سے ہیر کا قصہ ایک منفرد گلاب کی مانند کھلا ہے، جس طرح فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالی تھی اسی طرح میں نے گہری فکر کے بعد قصے کے جوہر کو نکالا ہے۔ ہیر کا یہ قصہ گلاب سے تیار کیا ہوا عطر ہے کہ جس کی خوشبو ہر جانب پھیلے گی۔ وارث شاہ نے ایک پرانی لوک کہانی اور روایات میں سفر کرتے ہوئے عوامی قصے میں اپنی فکر و نظر اور اپنے احساسِ جمال سے نئی زندگی پیدا کر دی۔ وارث شاہ کی یہ کہانی بھی روایات سے کچھ اسی طرح ہم آہنگ ہو گئی جیسے یہی اصل کہانی ہو، اب جب بھی ہیر رانجھا کا ذکر آتا ہے ذہن کسی اور جانب نہیں جاتا، جاتا ہے تو بس ہیر وارث شاہ کی جانب۔

ہیر وارث شاہ کی یوں تو اور بہت سی خصوصیات ہیں لیکن اس کی ڈرامائی خصوصیات بلاشبہ بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، وارث شاہ نے اس قصے کو ایک ڈراما بنا دیا ہے، اس کی بے پناہ مقبولیت کا ایک بڑا سبب اس کی شاعری کا آہنگ اور مصرعوں میں پوشیدہ غم و انبساط کی کیفیتیں ہیں جو پڑھنے والوں اور سننے والوں کو ایک انتہائی رومانی فضا سے آشنا کرتی ہیں اور دوسرا سبب اس کی ڈرامائی کیفیات اور خصوصیات ہیں، وارث شاہ لفظوں کے جادوگر ہیں، علامتوں اور استعاروں کو جگمگاتے جگنوؤں کی طرح اُچھال دیتے ہیں، کبھی کبھی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں، اسی طرح ڈرامائی کشمکش اور تصادم کی فضا پیدا کرتے جاتے ہیں۔ کرداروں اور ان کے مکالموں میں باطنی کیفیتوں اور شخصیتوں کے تصادم کو نمایاں کرتے ہیں۔ پیکر تراشی اور صورت گری میں بھی اپنی مثال آپ ہیں، شاعری کے خوب صورت آہنگ اور مصرعوں میں پوشیدہ غم و نشاط کی کیفیتوں کی وجہ سے "ہیر وارث شاہ" کو گاؤں گاؤں میں مقبولیت حاصل ہوئی لوگ اپنے خاص سُر میں اشعار سناتے، سننے والوں کی تعداد بھی کم نہ ہوتی، گرمی کی دوپہر اور سردی کی راتوں کی اپنی رومانیت ہے، جب گرمی کی دوپہر اور سردی کی راتوں کی رومانیت میں "ہیر وارث شاہ" کے نغمے گونجتے تو یقیناً رومانیت اور گہری اور معنی خیز ہو جاتی۔

وارث شاہ جب ہیر کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں تو ایک جانب اُن کے احساسِ جمال کی پختگی کی پہچان ہوتی ہے اور دوسری جانب اس منظوم داستان کی جمالیاتی سطح کی رفعت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے، فرماتے ہیں ہیر کی دلفریب صورت کے خد و خال اتنے

دلکش ہیں کہ لگتا ہے جیسے ہم قرآن پاک کے چمکتے اور روشن حروف دیکھ رہے ہیں۔ پیشانی ماہتاب ہے، زلفیں جو دل کو لہولہان کرتی ہیں چہرے کے دو جانب سے حلقہ ڈالے ہوئی ہیں جیسے چاند کے گرد رات نے گھیرا ڈالا ہو، ہیر کا رنگ شہاب کی مانند سرخ، آنکھیں۔۔ ہرن جیسی، رخسار گلاب جیسے دہکتے ہوئے، بھویں۔۔۔ لاہوری کمان کی طرح، اُسے ایک نظر دیکھ لینا لیلتہ القدر کو دیکھ لینا ہے، ہونٹ۔۔۔ یاقوت کی مانند سرخ، ٹھوڑی۔۔۔ سیب کی طرح، ناک۔۔۔ حضرت امام حسینؑ کی تلوار جیسی نوکدار۔ زلف۔۔ اُسی ناگ کی طرح جو خزانے کی حفاظت کرتا ہے، دانت۔۔۔ وہ موتی جو ہنس کی غذا ہوتے ہیں، ہاتھ۔۔۔ نرم نرم برگ چنار کی طرح، قد۔۔۔ باغ فردوس کے سرو کی مانند، گردن۔۔۔ کونج کی گردن جیسی اور انگلیاں ۔۔۔ روانہ کی پھلیاں جیسی۔۔۔ باہیں۔۔ بیلنے کی طرح گول، مکھن میں گوندھی ہوئیں، سینہ ۔۔۔ گندھار سے لائے ہوئے سنگ مرمر جیسے، بلخ کے دو سیب، ناف۔۔۔ بہشت کی حوض، سفید شانے، پرکشش سرین اور پنڈلیاں، لنکا کے باغ کی پری۔۔ چناب کی موجوں سے اُبھری ہوئی کوئی حور، طوفانی ندی میں تیزی سے آگے نکل جانے والی کونج۔

قیامت کا سراپا ہے ہیر کا! وارث شاہ نے اس روایتی لوک کردار کو اپنی فنکاری کا جو جوہر عطا کیا ہے اس نے اسے انتہائی پرکشش بنا دیا ہے، یہ سراپا اشعار کے آہنگ سے حسیات کو جھنجھوڑ دیتا ہے، وارث شاہ نے ہیر میں جو جنسی کشش پیدا کی ہے وہ غیر معمولی نوعیت کی ہے، استعارے، اشارے جگنوؤں کی طرح اُڑتے نظر آتے ہیں ایسا بھی لگتا ہے جیسے مختلف رنگوں کی تتلیاں ہر جانب اُڑ رہی ہیں۔ 'ہیر وارث شاہ' کی جمالیاتی سطح کا ایک دوسرا پہلو یا مظہر اس طرح سامنے آتا ہے۔ رانجھا پیروں کے پاس بیٹھ کر بانسری بجاتا ہے ایک پُر وقار رومانی فضا خلق ہو جاتی ہے، بانسری بجانے والے اور راگ الاپنے والے کی کیفیت ایک مست دیوانے کی ہو جاتی ہے، وارث شاہ نے مختلف راگوں کا ذکر کر کے وجد آفریں کیفیت طاری کر دی ہے رانجھا کی حالت یہ ہے کہ وہ کبھی کاہن کے بھجن گاتا ہے اور کبھی پہاڑی مانجھ الاپنے لگتا ہے، کبھی بونبار اگ سناتا ہے اور کبھی ڈھول کی آواز سے مست کر دیتا ہے، کبھی سوہنی اور مہیوال کا نغمہ چھیڑ دیتا ہے اور کبھی کسی اور رومانی قصے کے بول سنانے لگتا ہے اور پیروں کے وجود میں ہلچل سی مچ جاتی ہے، وہ حیرت زدہ ہیں، ایک جانب سنتے ہیں، کیدار، بہاگڑا، 'مارو راگ' اور دوسری جانب چند ہی لمحوں کے اندر سنتے ہیں پوربی، للت، بھیروں، گجریاں، سورٹھ اور دیپک راگ! رانجھا دیوانہ وار کبھی ٹوڈی سناتا ہے اور کبھی ملہار، کبھی گونڈ، دھناسری اور 'جیت

سری، کبھی کہان کے ساتھ مالکوس اور کبھی بھیروں، بھیم پلاسی اور نٹ راگ، کبھی بسنت گاتا ہے کبھی ہنڈولا، کبھی گوپی سناتا ہے اور کبھی منداونی کی راگ مالا۔!

اس طرح نغموں کی ایک کائنات وجود میں آجاتی ہے، لوک گیتوں کے آہنگ اور کلاسیکی موسیقی کی لہروں کی آمیزش اس قصے کی جمالیاتی سطح کو اور بھی پُر وقار بناتی ہے، ہوتا یہ ہے کہ رانجھا پانچوں پیروں کو یاد کرتا ہے اور وہ آجاتے ہیں، پوچھتے ہیں کیا بات ہے کیوں بلایا ہے ہمیں؟ رانجھا زار و قطار رونے لگتا ہے، آنسو تھمتے ہی نہیں، پانچوں پیر اسے دلاسا دیتے ہیں تو کہتا ہے ہیر کی دنیا لٹ رہی ہے، سب عشق کی توہین کر رہے ہیں، اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے، ہم دونوں برباد ہو جائیں گے، ایک پیر کہتے ہیں اے رانجھے ہیر کی مصیبت دور کرنے کے لیے ہم نے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو روانہ کر دیا ہے، اب تم سکون سے بیٹھ کر بانسری سناؤ، یہ سنتے ہی رانجھا بانسری بجانے لگتا ہے، اس کی مدھر آواز ہر جانب گونجنے لگتی ہے اور اس کے بعد لوک گیتوں کے بول اور پکے راگ سنانے لگتا ہے، پانچوں پیر جھوم جھوم جاتے ہیں، یہ دونوں پہلو یا مظہر "وارث شاہ" کی تخلیقی صلاحیتوں کو شدت سے اجاگر کرتے ہیں، رنگ و نور اور شعر و نغمہ اور موسیقی و آہنگ کی جو دنیا بجی، وہ اپنی نوعیت کی منفرد دنیا ہے۔ روایتی لوک قصے میں ایسے مظاہر سے جان پرور کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

'ہیر وارث شاہ' میں جو ڈراما ہے اُس کی بنیاد مکالموں پر ہے، مکالموں سے جہاں احساسات اور جذبات کا اظہار ہوا ہے وہاں کرداروں کی خارجی اور باطنی کشمکش اور تصادم کی سچائیاں بھی اُجاگر ہوئی ہیں مُوجو چودھری گاؤں بھر کا سردار ہے، اس کے آٹھ بیٹے ہیں دو بیٹیاں ہیں، دھیدو (رانجھا) سب سے چھوٹا ہے جسے وہ سب سے زیادہ پیار کرتا ہے، بڑی جائداد کا مالک ہے، رانجھا کے بھائی حسد کرتے ہیں اور رانجھے کے دل کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، مُوجو چودھری کا انتقال ہو جاتا ہے، زمین کا بٹوارا ہوتا ہے تو قاضی کو رشوت دے کر رانجھے کے بھائی اچھی زمین پر خود قابض ہو جاتے ہیں اور بنجر زمین رانجھے کے حوالے کر دیتے ہیں، بھاوجیں ہیں جو ہر وقت رانجھے پر طنز کرتی رہتی ہیں، اُسے پریشان کرتی ہیں، رانجھا گھر چھوڑ دیتا ہے، دور ایک مسجد میں آتا ہے، یہاں ملّاجی کے ساتھ سوال جواب ہوتا ہے، پھر وہ دریا پر آتا ہے جہاں ملّاح سے جھگڑ پڑتا ہے۔ چند عورتیں مہربان ہوتی ہیں تو وہ ندی پار کرتا ہے، اس کے بعد اس کے مردانہ حسن کا چرچا ہوتا ہے اور ہیر قریب آتی ہے، اسے دیکھ کر رانجھا حیرت زدہ رہ جاتا ہے، اس کے سامنے حسن کا غرور جیسے تن کر کھڑا

ہو! کانوں میں موتی، سرخ رنگ کے کپڑے، ناک میں بلاق۔ سراپا حسن، پھر دونوں میں پیار ہو جاتا ہے، رانجھے کی نگاہیں ہیر کے دل میں اُتر جاتی ہیں، ہیر باپ کو بتاتی ہے کہ رانجھا تخت ہزارے کے چودھری کا بیٹا ہے، ذات کا رانجھا ہے، سادہ بولا بھالا ہے، پیشانی پر نور ہے ہیر کا باپ شادی کے لیے راضی نہیں ہوتا، رانجھے کی پانچ پیروں سے ملاقات ہوتی ہے جو اس کی مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، یہ پیر ہیں خواجہ خضر، حضرت شکر گنج، حضرت زکریا ملتانی، سیّد جلال بخاری اور لعل شہباز، خواجہ خضر رانجھے کو طرّہ دیتے ہیں۔ حضرت شکر گنج رومال، لعل شہباز مندرا اور سیّد جلال بخاری خنجر! کہتے ہیں جب ضرورت ہے ہمیں یاد کر لینا۔ کئی اور واقعات رونما ہوتے ہیں، ہیر کی شادی کہیں اور طے ہو جاتی ہے، ایک شخص کیدر کا بھی کردار ملتا ہے جو تھوڑی دیر مرکز نگاہ بنتا ہے، قاضی اور ہیر کی گفتگو سے ڈرامے میں ایک اٹھان پیدا ہوتی ہے، ڈراما نقطہ عروج تک پہنچنے لگتا ہے، شادی کے باوجود ہیر رانجھے کی بنی رہتی ہے، ہیر اور رانجھے کی گفتگو سے دونوں کے احساسات کہانی کو نقطہ عروج تک لے آتے ہیں، اس کے بعد کہانی کا زوال (Fall) تو ہوتا ہے لیکن پھر کئی واقعات شامل ہو جاتے ہیں، رانجھا جوگی بنتا ہے اور کہانی میں نئی دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے، آخر میں ہیر کو ساتھ لے کر رانجھا وطن کی جانب چلا جاتا ہے، عقد سے پہلے ہیر مر جاتی ہے، اس خبر کے سنتے ہی رانجھا کی روح بھی پرواز کر جاتی ہے۔ وارث شاہ کہتے ہیں یہ دنیا خوابوں کی سرائے ہے، جانے کتنے آئے اور اپنے گیت سنا کر چل دیے!

اس داستان میں کئی ڈرامائی اُتار چڑھاؤ ہیں، بعض مقامات پر تجسس بڑھتا ہے اب کیا ہوگا۔۔۔

وارث شاہ نے بات چیت، گفتگو اور مکالموں سے قصّے کی تعمیر میں مدد لی ہے اور کشمکش اور تصادم کو اُبھارا ہے۔ کہیں کہیں باطنی کیفیتوں کے تاثرات بھی اُبھارے ہیں۔ مکالموں کی چند خصوصیات ملاحظہ فرمائیں:

رانجھے کی ایک بھاوج کہتی ہے "جو شخص ہر وقت سنگھار کرتا رہے، آئینہ سامنے رہے ایسے شخص سے بھلا کیا اُمید کہ وہ ہل چلائے گا۔

رانجھا بھاوجوں سے کہتا ہے "تم نے اپنے مردوں کو مینڈھوں میں تبدیل کر دیا، تم سب تو رسی کو سانپ بناتی ہو"

"جلے ہوئے پتنگوں کو جلانے سے کیا فائدہ؟"

"تو انسان کو چڑھا کر سیڑھی کھینچ لیتی ہے"
"اگر تو نے انا الحق کی آواز نکالی تو تجھے بھی منصور جیسی موت ملے گی۔"
داڑھی کو شیخ جیسی بڑھائی ہے لیکن عمل شیطان کے سے ہیں۔"
"جو زبردستی میری کشتی میں بیٹھتا ہے اسے بیچ دریا میں ڈبو دیتا ہوں۔"
"چناب کی گہرائی کا اندازہ سینکڑوں بلیاں بھی نہیں لگا سکتیں۔"
"عاشق، بھنورے، فقیر اور کالے ناگ منتر کے بغیر بس میں نہیں کیے جا سکتے۔"

ایسے جانے کتنے فقرے اور جملے ہیں جو اس فسانے میں ڈرامائیت پیدا کرتے ہیں۔ ان سے تصادم اور کشمکش اور کردار کی اندرونی کیفیات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ 'ہیر وارث شاہ' کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کردار اپنے فقروں سے مسلسل اپنے رویّوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

اس منظوم داستان کے کردار زندہ لوگوں کے ساتھ زندہ رہے، کلچر ان کی حفاظت کرتا رہا، ہیر اور رانجھا دونوں فکشن، کی طرح زندہ رہے ایسے فکشن کی طرح جو سماج کے بعض طبقوں اور حلقوں میں حقیقت اور 'سچائی' بھی بنے رہے ہیں ایسے کرداروں کے "مقبرے" اور "کتبے" تاریخی حیثیت بھی اختیار کرتے رہے ہیں۔

'ہیر وارث شاہ' اور ایسی داستانوں اور فسانوں کی ٹریجیڈی "فلسفیانہ" رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ٹریجیڈی سوال اُٹھاتی ہے اور ان کے حل کے لیے دعوتِ غور و فکر دیتی ہے۔ زندگی کے مسائل کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی مسائل بھی اٹھتے ہیں، معنی و مفہوم کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہوئی یہ ٹریجیڈی دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ ایسے المیہ قصوں کے ہیرو اپنے عمل میں بہت آزاد ہوتے ہیں، رانجھا بھی اپنے عمل میں بہت آزاد ہے، ہیر بھی رانجھا سے پیچھے نہیں ہے وہ بھی آزاد ہے اور اپنے گھر کے سماج سے ٹکراتی بھی رہتی ہے، ان کرداروں کی اپنی قدریں ہیں جنھیں داستان پڑھنے والے اور سننے والے اپنی قدریں سمجھنے لگتے ہیں۔

بلاشبہ غم و نشاط کی لہروں پر اُبھرتی ہوئی یہ رنگین اور شاداب کہانی ہندستانی ادبیات کی ایک اہم روایت بن گئی ہے!

اکبر حیدری کشمیری

مرزا غالب اور اودھ اخبار

۱۸۶۰ء - ۱۸۷۰ء

مشہور تاجر کتب اور ناشر منشی نولکشور (۱۸۳۶ء - ۱۸۹۵ء) منشی ہرسکھ رائے مالک اخبار "کوہِ نور" لاہور کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ اور یہاں اپنا پریس "مطبع اودھ اخبار" ۱۸۵۸ء میں کوٹھی مہاراجہ مان سنگھ بہادر میں قائم کیا۔ پھر دوسرے سال غالباً اکتوبر ۱۸۵۹ء میں چھوٹی تقطیع میں اودھ اخبار جاری کیا۔ اس کے ابتدائی پرچے نہیں مل سکے۔ البتہ جنوری ۱۸۶۰ء سے جون ۱۸۷۵ء تک کے اکثر و بیشتر شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ اخبار اردو معلومات کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ اس میں غالب کے علاوہ میر انیس، مرزا دبیر، سر سید احمد خاں، منشی نولکشور، اسیر لکھنوی، منشی ہرگوپال تفتہ، میاں داد سیاح، عزیز بنارسی شاگرد غالب، جوہر سنگھ جوہر شاگرد غالب، نسیم دہلوی وغیرہ کے بارے میں بہت سی نئی باتیں ملتی ہیں۔

اودھ اخبار میں اردو کی حمایت میں معرکہ آرا مضامین شائع کیے جاتے تھے کئی مضامین خود منشی نولکشور نے لکھے ہیں۔ وہ اردو کے زبردست حامی تھے۔ اخبار کی ۱۲ر جولائی ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں ایک مضمون اردو کی حمایت میں چھپا ہے جس میں اردو کے مخالفوں کو مسکت

؎ جنوری ۱۸۶۰ء کے پہلے شمارہ میں جیسا کہ سرورق کے عکس مورخہ ۱۸ر جولائی سے نمایاں ہے "اودھ اخبار" کے گول دائرے میں ذیل کے شعر درج ہوتے تھے ؎

ہنرمندوں کا ہو آویزۂ گوش — کہ یہ اخبار گوہر بار نکلا

ہوئی دل کو جو فکرِ سال تاریخ — "کیا دلکش اودھ اخبار نکلا"

۱۲۷۶ ہجری (۱۸۶۰ء)

جواب دیا گیا ہے۔ مضمون میں کہا گیا ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کو ایک ایسے دریا سے تشبیہہ دی گئی ہے جس میں مختلف ندیاں آ آکر شامل ہوتی ہیں۔ مضمون میں واشگاف الفاظ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اردو رسم خط کی بجائے دیوناگری اختیار کرنے کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ ایک مکمل اور وسیع زبان کو ترک کر کے کم مایہ اور ناقص زبان قبول کی جائے۔ مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"ہمیں اپنی زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہماری ملی زندگی وابستہ ہے۔"

اودھ اخبار مورخہ ۱۲ ر اپریل ۱۸۷۰ء، صفحہ ۲۵۹ پر ایک معلومات افزا مضمون بعنوان "زبان اردو" شائع ہوا۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

"اودھ کے واسطے عدالتوں میں اردو کا رواج انصافاً درست ہے اور اس کا جائز ہونا چند خوبیوں سے، جو آگے بیان کی جاتی ہیں، مبرہن ہے۔ اگرچہ زبان ناگری میں بھی بہت خوبیاں ہیں لیکن چند قبائح ایسے ہیں جو بہ نسبت اردو کے زیادہ تر مُضر ہیں۔ اردو زبان سے اگر بہ نظر تامل و تعمق دیکھا جائے تو بہت سی ایسی خوبیاں ظاہر ہوں گی کہ عقل خردہ بین اس کو پسند کرے۔ اردو زبان کو اگرچہ تھوڑا عرصہ گزرا ہے کہ جاری ہوئی لیکن ہندوستان میں اس کا اس قدر رواج ہے کہ دوسری زبان کا نہ ہوگا۔ فرض کیا جائے کہ اردو کچہری سے موقوف کر کے اس کی جگہ ناگری جاری کی جائے تو صرف ناگری خوانوں سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک کہ اس کے اصول یعنی سنسکرت کو اچھی طرح حاصل نہ کریں۔ اور ایسے لوگوں کا میسر آنا فی الحال بہت دشوار ہے۔ جو سنسکرت سے بخوبی آگاہ ہوں اور اگر سنسکرت داں ملیں گے تو عدالت کے کام سے محض ناواقف ہوں گے۔ اگر وہ ناواقف لوگ عدالت میں مقرر کیے جائیں تو بلا سمجھے بوجھے مقدمات فیصل کرنے میں سراسر ظلم ہے۔ پس مناسب ہے کہ رعایا کی توجہ جس علم کی طرف زیادہ ہو دفتر میں وہی علم جاری رکھنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ایک رئیس خواہ اہلِ اسلام ہو یا اہلِ ہنود سب کو فارسی اور اردو کی طرف رغبت ہے۔ چنانچہ ان کے لڑکے قابل تعلیم کرنے کے ہوئے۔ یعنی جیسے

پانچ چھ برس کو پہنچے ویسے ہی ان کو فارسی پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ نہ اب دفتر فارسی رہا اور نہ اس کی قدر ہے۔ باعث یہ ہے کہ وہ فارسی اردو وغیرہ کو اپنا علم خاص تصوّر کرتے ہیں اور اردو کی کثرت رواج سے سنسکرت اور ناگری ایسی محو ہو گئی ہے کہ دیہات اور قصبات میں بھی اردو جاری ہے اور ایسی زبان بولتے ہیں جن میں اکثر الفاظ عربی اور فارسی کے شامل ہوتے ہیں۔ بہرنوع ناگری دفتر میں بہ نسبت اردو کے زیادہ لوگوں کو دقّت ہوگی۔"

اخبار مختلف سائزوں میں ہفتے میں مختلف ایّام میں پابندی کے ساتھ چھپتا تھا۔ ابتدا میں ۳۲ × ۲۴ سینٹی میٹر میں سہ شنبہ میں چھپتا تھا۔ پھر چارشنبہ اور ہفتے کے دن چھپنے لگا۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اخبار کی ضخامت کبھی ۱۶ اور کبھی ۲۴ صفحوں کی ہوتی تھی۔ جنوری ۱۸۷۰ء سے ہر سہ شنبہ کو تین کالموں میں ۱۴ × ۱۱ انچ کی تقطیع میں ۲۶ صفحوں میں چھپنے لگا۔ ہر سال جلد کا نمبر بدل جاتا تھا۔ سال بھر کے لیے صفحات کا تسلسل رہتا تھا۔ اخبار کی عنانِ ادارت اچھے اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ان میں منشی شیو پرشاد، غلام محمد تپش، رونق علی، مولانا محمد ہادی اور سرشار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا غالب اور منشی نولکشور کے درمیان تعلّقات مربوط اور استوار تھے۔ غالب اپنی تصنیفات منشی صاحب کے مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں چھپوانا چاہتے تھے۔ اس بارے میں ۱۸ ماہ جولائی ۱۸۶۰ء کو نولکشور صاحب کے نام اپنی تصانیف کی اشاعت اور اودھ اخبار سے متعلق لکھتے ہیں:

"... امروز سخن می گویم۔ باکسے کہ دیدہ روشن نادیدہ است، ودل بہ مہرش گردیدہ۔ اینک فرمانِ شما پذیرفتم و درنامہ بپارسی آمیختہ، بہ تازی سخن گفتم، سہ نسخۂ نثر دارم، پنج آہنگ، و مہر نیمروز، دستنبو، بشگفت کہ در لکھنؤ نیز مردم ایں نامہ ہائے نامی داشتہ باشند۔ اگر ذوقِ نگارشِ پارسی دارند، چرا ایں سوادہا را فراہم نیارند۔ رسیدن اودھ اخبار ازاں سو در ہر ماہ چہار بار و رسیدن زر ازیں سو در ہر سال، دو بار اگر منظور دارند، منظور است۔ بہ اقبال نشاں میاں داد سیاح دعای فرستم و بہ دوستی گفتہ ام تا پارسی غزلے چند نوشتہ دہد، ہمیں کہ ہمیں آرد بسوئے شما رواں می دارم"۔[۵]

مرزا غالب کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء میں "میخانۂ آرزو سر انجام" کے نام سے مرتب ہو چکا تھا. اور یہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاءالدین احمد خاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا۔ مرزا اس کے دوسرے ایڈیشن کو کلیات نظم فارسی کے نام سے شائع کرنے کے فکرمند تھے۔ اس سلسلے میں جولائی ۱۸۶۱ء میں میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ قاطع برہان کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا۔"[۵۲]

منشی نولکشور نے ۱۸۶۱ء کے آخر میں مرزا غالب کا کلیات فارسی نواب ضیاءالدین احمد خاں سے جو انھوں نے بعد غدر بڑی مشکل سے جمع کیا[۵۳] اشاعت کے لیے منگوایا۔ منشی صاحب نے اودھ اخبار مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کی اشاعت میں کلیات کی طباعت کا اشتہار شائع کیا۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا)۔ مرزا کلیات کی اشاعت کے لیے بے چین تھے۔ اس کے بارے میں سید غلام حسنین قدر بلگرامی کو مئی ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں :

"اس رقعہ کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے۔ اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے۔ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا۔ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے۔ قصیدے اور کلیات کا مطبع میں پتہ لگتا ہے کہ نہیں۔"[۵۴]

مرزا غالب کی کتاب قاطع برہان منشی صاحب نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔ کلیات غالب ابھی تک نہیں چھپا تھا۔ ستمبر ۱۸۶۳ء میں مرزا اپنے شاگرد بدرالدین احمد کاشف کو لکھتے ہیں :

"اب سنا ہے کہ وہ کلیات چھپ کر آیا ہے۔ روپیہ کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو ۶۵ بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔"[۵۵]

مورخہ ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء کے اخبار میں مرزا غالب کے بارے میں ایک اطلاع درج ہے۔ اس میں غالب کا ایک اہم خط منشی صاحب کے نام درج ہے۔ غالب لکھتے ہیں :

"منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نولکشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال روز افزوں نصیب ہو۔ چونکہ احباب، کامیابی و شادکامی احباب

سے شاد ہوتے ہیں، اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاد آوری سے ایک امر خوشی کا پیش آیا تو آپ کی خوشی کے واسطے آپ کو لکھتا ہوں بلکہ نظر ہمدگر کے اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ آپ کو مبارک ہو کہ آخر ماہ گذشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن ۳ رمارچ ۱۸۶۳ء حال کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور از راہ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا...“

اخبار مذکور میں خط سے پہلے منشی نولکشور کی یہ نایاب تحریر بھی غالب کے عطائے خلعت کے بارے میں درج ہے :۔

” قدر دانیِ حکّام ۔ بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں ۔ دیکھیے ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی ۔کمال کی قدر دانی کی ۔ نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر نے مرزا اسداللہ خاں کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا۔ اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کرکے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔ زیاد احتیاج بیاں ہے ۔ ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے :“

منشی نولکشور دسمبر ۱۸۶۳ء کے آغاز میں کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ سے دہلی گئے۔ اور وہاں مرزا غالب، نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر رخشاں اور ان کے بیٹے نواب شہاب الدین خاں سے بھی ملے ۔ یہ منشی صاحب اور مرزا غالب کی بالمشافہ پہلی ملاقات تھی ۔ مرزا صاحب نے منشی صاحب کے ساتھ دوران ملاقات کلیات فارسی کی قیمت پر بھی گفتگو کی ۔ اس سلسلے میں غالب، مرزا علاءالدین علائی کو ۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :۔

”شفیق مکرم ولطفِ مجسّم منشی نولکشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے ۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے ۔گویا بجائے خود ”قران السعدین“ ہیں ۔تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس جلد کی قیمت صه مان لیے تھے ۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار لینی قبول کی ۔ یعنی پے فی جلد ۔ اسں صورت میں

دس مجلد بھیجو میں دوں اور بھیجو علی حسین خاں کو دے دوں۔ کہو لکھنؤ بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلد دو۔[۲]

دہلی میں مرزا غالب سے منشی نولکشور نے جو ملاقات کی اس کے بارے میں غالب، مردان علی خاں تخلص رعنا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت۔ سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں۔ تمہارے وہ مدّاح اور میں ان کا ثنا خواں۔"[۳]

غالب ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو ایک اور خط مرزا علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

"نہ دن یاد نہ تاریخ۔ آج چوتھا یا بھی شاید بھول گیا ہوں۔ پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بہ سواری ڈاک رہ گرائے ہوئے... کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یکشنبہ ۱۳ر دسمبر (۱۸۶۳ء) کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا۔ مگر چونکہ تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے یعنی ۷۵۰ سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رامپور سے اور چوبیس ان مہاراج (منشی نولکشور) سے توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں۔ قیمت نہیں لیتے۔ مگر اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔"[۴]

منشی صاحب غالب کی ملاقات کے بعد دہلی سے لکھنؤ واپس پہنچے تو انھوں نے اپنی ملاقات کے بارے میں اودھ اخبار مورخہ ۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۱ر رجب ۱۲۸۰ ہجری، جلد ۵، نمبر ۱۵، صفحہ ۸۵۳ میں ذیل کی اطلاع شائع کی:

"جناب فیض مآب یگانہ سحر پرداز، نکتہ سنج سراپا اعجاز، رنگ افزائے نازک خیالی، ہنگامہ آرائے بے مثالی۔ دقیقہ یاب فکر و نظر آموزگار اہل ہنر، زندۂ لوائے سحابی نوازندۂ کوس شیوا زبانی ناشر نفحات یکتائی، در مشارق و مغارب جناب میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب کی ملازمت سے مشرف ہوا۔ شرف

ملازمت کا حصول اتفاقات نادرہ سے سمجھا۔ عنایت ایزدی کا شکریہ ہے کہ ایسے وحید عصر یگانۂ آفاق، سرآمدِ فضلائے روزگار، آفتاب اقلیم فضل و کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔"

اودھ اخبار جلد ۴ نمبرا صفحہ ۲۴ مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء

"اشتہار طبع کلیاتِ مرزا غالب دہلوی"

اک بشارت نئی سنو ہم سے　　　گوہرِ آبدار لو ہم سے

"ایسا مژدہ سناتے ہیں کہ کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں، مرحبا کہیے شاہدِ شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سر بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دو چار ہوں گے، نقد تمنا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھایئے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھایئے۔ آویزۂ گوش جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو۔ کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دلارام رنگین ادا کا شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد بے بدل ہے۔ عالی مضامین، قصائد لاجواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جایئے۔ نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لایئے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں۔ سحرِ حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیے۔ آبدار قطعات کو بے تردد قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہد ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاالدین خان صاحب بہادر دہلوی نے جدوجہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کی تعریف کی حاجت نہیں آفتاب کو صفات بیاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر نقطہ ان کے قلم کا اخترِ اوجِ کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحرِ حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کسی خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم دُرِ نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جزو میں چھپے گی۔ محض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے پر ہے

کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے حصّے مقرّر ہو جائیں گے۔ غالباً اہلِ ہنر سنتے ہی احتراز میں آئیں گے۔ چھپے تو دو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لیے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے۔ صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مدِّ نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلبگار رہوں کی قیمت کے حصّہ دار ہوں۔"

اودھ اخبار لکھنؤ۔ جلد ۴ نمبر ۱۴ صفحہ ۱۸۵ مورّخہ ۱۲ / مارچ ۱۸۶۲ء

"نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب"

"سب جانتے ہیں۔ کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں ان کا عدیل نہیں۔ فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں۔ فنِ شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمینِ سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطے کو اختر اوج معانی بنایا۔ زورِ فکر ان کا جہاں میں مشہور ہے نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانیاں مآب ملکۂ معظمۂ ہند و انگلینڈ کی مدّاحی میں وہ پایہ بلند و رتبۂ ارجمند پایا۔ کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اس کا دسواں حصّہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے۔ اپنی کتاب دستنبو میں مفصّل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظّمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظرِ انور سے گزرنے کو ولادیت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدردانی ہے۔ کھلا ہوا بابِ فیض رسانی ہے۔ جب فیض یاب سماعت ہوا منظورِ نگاہِ مرحمت ہوا۔ جود و نوال کی طرف ہمّت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنّف کو انگریزی چٹھی لکھی۔ ولایت سے ڈاک پر بھیج کر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمھارے قصیدے کے انعام کا مقدّمہ زیرِ تجویز ہے۔ عنقریب حظ اٹھاؤ گے۔ بعد صدورِ حکم انڈیا گورنمنٹ سے اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمینِ ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کل متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بے گناہ یوں زیرِ آسیائے گردوں پسے، جس طرح چکّی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا۔ کیا انجام ہوا کہ ہر مترصد بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔

ع جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا

عجب نہیں کہ پرورش سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالتِ یاس میں لطفِ خسروانی سے

امید بر آئے۔ اس تقریب میں ایک ذکر اور سنیے کہ ان دنوں جب "تعزیتِ شاہزادۂ عالی پائگاہ عالمگیر" تھی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیشگاہِ حکام سے مشاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھ دیا۔ نواب صاحب نے اس راہ سے کہ صاحبِ سخن ہیں۔ مدحتِ سرائے حضرت ملکۂ زمن ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی ؎

شاہِ عالی گہر و گوہر پاکش صد حیف
ویں کہ ناچار سپرد ند بخاکش صد حیف

اودھ اخبار لکھنؤ، جلد ۴، نمبر ۱۷، مطبوعہ ۲۳ر اپریل ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۸۱

"ہندوستان کی سمجھ"

"افغانستان کا روزنامچہ مدّت دراز سے سُنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ صحائفِ اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال گزر گئے۔ سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے باندھنو باندھے تو طیے اٹھائے۔ بعض اپنے گمان پر سیکڑوں قیاس لگائے۔ اے بے فکرو! خدا سے ڈرو۔ ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گڑھا کرتا ہے؟ خصوصاً وقائع نگاراں انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے؟ کیا کریں جب عموماً صحیفوں کو ایسی اخبارات سے ملوا پاتے ہیں۔ تو ہم بھی حسب ضرورت کو انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں چھپواتے ہیں۔

آجکل دانائے روزگار، سرآمدِ ابوالابصار، ارسطو فطرت، فلاطوں فطنت جناب والا شانِ عالی مناقب، مرزا اسد اللہ خان غالب نے جن کی سلامتِ ذہنِ مستقیم پر قسم کھایئے۔ استقامتِ رائے سلیم کے صدقے جایئے۔ نافھموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے مضمونِ خیالی سے توارد ہوا۔ ایسی تقریر فرمائی ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کش ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔"

نثر غالب

"یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند، مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں، شاد ہوتے ہیں۔ سیکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں۔ یہ عافیتِ دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو از بسکہ توجہ صرف رفاہِ عام کی ہے۔ اِدھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔ بفرضِ محال اگر اس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبانِ عالی شان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے۔ جائے انصاف ہے۔ جن موید من اللہ حاکموں نے اپنی فوج باغی کو صرف اپنے حسن تدبیر و ضرب شمشیر سے زیر کیا ہے۔ ہندو مسلمان جو اہلِ ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا و قحط کے دکھ سہے ہیں وہ اپنی سلامت و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں۔ اگن بوٹ اور ریل گاڑی صنعت کو دیکھیں۔ تار بجلی میں پیام کے پہنچنے کی سرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی رونق اور رواجِ علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں۔ ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے۔ قلمرو ہند نمونۂ گلزار ہو گیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے۔ وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے۔ حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور، بہر صورت ہے۔ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اس شخص کی خوبیِ قسمت ہے۔ آدمی زحمت خاص کو نہ دیکھے۔ رحمتِ عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے۔ امن و امان کا طالب، بخت و قسمت کا شاکی۔ غالب فقط۔"

اودھ اخبار جلد ۴ (صفحہ ۶۳۲-۶۳۳) مطبوعہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء - چہار شنبہ

(غالب کا خط)

"جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۷ ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر الور میں مندرج ہے کہ مہاراجہ الور کے جنگل

سے ایک شیر کو کوٹھی میں قید کر کے کئی روز گرسنہ کر کے جب وہ شور و شر سے باز رہا، پنجرۂ آہنی میں گرفتار کر لائے۔

اے صاحب! مہاراجہ تو والیِ ملک اور صاحب اقبال ہیں۔ وہ تو شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کرا کر منگا دیں۔ ان کے رعبِ عدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں۔ پھر ان کو شیر کیا حقیقت ہے۔ میں اس پہ ایک ذکر تعجب خیز اور فسانۂ حیرت انگیز گرفتاری زندانِ شیر کا بے سروسامانی میں ایک معزز شخص کا سناتا ہوں۔ یعنی ۱۸۵۶ء میں محمد مردان علی خان صاحب نے کہ اس وقت تحصیلدار کوہ مری دارالقرار گورنمنٹ پنجاب کے تھے۔ اور اب سرکار پنجاب میں ایک اہل کار ہیں۔ خود ایک شیر ژیاں جنگل کوہ مری سے زندہ یوں گرفتار کیا تھا کہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا فقط اسی قدر کوٹھا بنایا کہ شیر اس میں سما سکے اور شکار لگا دیا تھا۔ ایک شیر مردم خوار اس میں قضا کار آ لگا۔ کئی سو آدمی خان صاحب کے ساتھ اس علاقے کے جمع تھے۔ ایک کو یارا پاس جانے کا نہ ہوا۔ اور ان شیر دل جرّی نے رستمانہ اس کے اوپر بیٹھ کر رسّی سے پھنسایا۔ اور پتھر اس کے منہ سے ہٹا کر خود ایک چوبی صندوق میں گرفتار کر کر قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور و غوغا کوسوں تک آدمیوں کے زہرے کو آب کرتا تھا۔ اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا اسی دن شجاعتِ خدا داد اور جرأت سے اس کو گرفتار کیا اور وہ چار ماہ پالا۔ پھر قضا سے مر گیا۔

یہ بات طشت از بام اظہر من الشمس ہے کہ وہ شیر پورے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا پکڑ لانا اس لیے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی شجاعت کئی وقت پر ظہور میں آ چکی ہے۔ یعنی جب وہ اٹک کی حدود پر تحصیلدار وغیرہ رہے تو ملک بائی اور ملک آفریدی سے صرف جریدہ جا جا کر بہت سے خونی اشتہاری مسلح بہادرانہ پکڑ پکڑ لائے اور ہزار ہا روپیہ سرکار انگریز سے انعام پایا۔ غدر حال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سینہ سپر رہے۔ کوہ مری سے بغاوت فساد میں جبکہ وہ دوسری تحصیل میں تھے کوہستان میں جا کر دافع فساد رہے۔ غرض شجاعت اور جرأت و دلیری بھی ایک بڑی نعمتِ خداداد ہے اور جبلّی ہے۔ کچھ اختیاری نہیں اور امیر غریب پہ بھی منحصر نہیں ہے۔ الغرض خانِ ممدوح بھی اسم بامسمّٰی ہے اور حق بجانب مرد کی صفت ہی مردانگی ہے۔

فقط بندۂ اسد اللہ"

اودھ اخبار، جلد ۵، نمبر ۱۹، مورخہ ۱۳ر مئی ۱۸۶۳ء روز چارشنبہ، صفحہ ۳۲۵

اس شمارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ 'کلیات مرزا غالب دہلوی' سوا پینتیس[۳۵] جز میں چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنف بھی یادگار ہے۔ سابق میں سوائے محصول پیشگی قیمت ۵ روپے قرار دی تھی اور بعد ختم صہ درج اخبار کی تھی۔ اب چونکہ رفاہ عام منظور ہوا قیمت کا گھٹا دینا ضرور ہوا۔ لہٰذا جن سے پیشگی قیمت وصول ہے انھیں تکلیف محصول نہ دی جائے گی۔ مطبع سے ٹکٹ لگا کر کتاب ارسال کی جائے گی اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے للعہ قیمت لیں گے۔ اور متعدد جلدوں کے خریدار کی رعایت بدستور ملحوظ ہے۔ ان کا حساب علیحدہ فہرست میں محفوظ ہے۔"

دونوں اشتہاروں میں معمولی ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ پہلے اشتہار سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب نہیں چھپی تھی اور زیر طبع تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ 'اودھ اخبار' کے متعدد شماروں میں غالب کی اس کتاب کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس سے کتاب کی مقبولیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

اودھ اخبار مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۸ر رجب ۱۲۸۰ ہجری روز چارشنبہ نمبر ۵۲ جلد ۵ صفحہ ۸۹۱

"نواب مرزا اسداللہ خاں غالب"

"مرزا صاحب اقلیم بلند نامی کے بادشاہ ہیں۔ سب خاص و عام ان کے نام گرامی سے آگاہ ہیں۔ ان کی تعریف زبان قلم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ کہ ان کی صفات حمیدہ اور کمالات پسندیدہ سے واقف تمام زمانہ ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے اعتبار ہے۔ فصحائے فارس کو ان کی تعریف داخل ہے۔ بار بار لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مرزا صاحب نے ایک قصیدہ لارڈ الیجن صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند کی مدح میں بھیجا۔ تو اس کے جواب میں سکتر اعظم کا دستخطی خریطہ آیا۔ اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پروپرائٹر مطبع کو نہایت سرور ہوا۔ کلیات غالب میں یہ قصیدہ نہ تھا۔ اب اس کا چھاپنا ضرور ہوا۔ لہٰذا مع نقل خط نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ذیل میں تحریر ہے۔ ناظرین با تمکین ملاحظہ فرمائیں۔ کہ ہر شعر بے نظیر ہے خط سے قدر دانی سرکار ظاہر ہے۔ عزت و توقیر میرزائے نامدار ظاہر ہے۔ و ہو ہٰذا۔

نقل خط

کرنل ڈور ینڈی صاحب چیف سکرتر بہادر گورنمنٹ در رسید قصیدہ بر کاغذ افشاں۔
نقل سرنامہ۔ درشہر دہلی خاں صاحب ابسیار مہرباں دوستان میرزا اسد اللہ خاں غالب۔
سلمہ اللہ تعالیٰ مرقوم۔ ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء۔

"خان صاحب ابسیار مہربان دوستان سلامت۔ قصیدۂ آب و تاب در مدحت بندگانِ نواب مستطاب معلی القاب ویسرائے و گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ وصول گرویدہ، بر رخ ارادت آں مہرباں آبی برجبینِ عقیدت ایشان تابے افزود و از گرانمایہ گوہرہائے بحر فکر یکتا سخنور معنی پرور کہ گنج بر گنج نہادہ بود از نظر قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ۔ طرب پیرائے خاطرِ جہاں حضرت ایشان گشتہ۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید۔ فقط دستخط انگریزی"

اس کے بعد پورا قصیدہ درج کیا گیا ہے۔

کلیّات نثر کی اشاعت۔

منشی نولکشور جب ۱۸۶۳ء میں مرزا غالب سے دہلی میں ملے تھے تو انھوں نے کلیات نثر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا نے ان کی درخواست قبول کی۔ منشی صاحب نے اِسے پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان ۱۲۸۴ ہجری میں بڑی تقطیع میں شائع کیا۔ خاتمۂ کتاب صفحہ ۲۱۲ پر ذیل کی عبارت "خاتمہ الطبع" درج ہے:

"الحمد للہ والمنتہ کہ دریں زمانِ سعید و آوانِ حمید از مترشحاتِ قلم اعجاز رقم جناب مستطاب والا خطاب دبیر ہمہ دان شاعر معجز بیان، بلبل شیوا زبان گلستان، انشا پرداز عندلیب نغمہ سنج بوستان مضمون طرازی، مہر نیمروز آسمان بلاغت، ماہِ نیم برج فصاحت نظیری، نظیر رشک سعدی، و فردوسی، غیرت صائب و ظہیر خاقان، ملکِ سخن تازگی بخش، مضامینِ نو و کہن، صاحب جود و کرم، فخر شعرائے عرب و عجم، شیر بیشۂ سخنوری، مسیح زبان پارسی، و دری، افصح الفصحا ابلغ البلغا، امیر کبیر جناب نواب نجم الدولہ دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب المشہور المشارق والمغارب چنانکہ درشانِ خودی فرماید۔ بیت ؎

لختے ز دساتیر بود نامۂ ما
ساسان ششم بکار دانی مائیم

الراقمہ ؎ — از سرِ انصاف مصنف را نشاید در گذشت
حق تعالیٰ رتبۂ انصاف بالا کردہ است
پارسیٔ مردہ را بخشید جانِ تازۂ
غالبِ معجز بیاں کارِ مسیحا کردۂ

کلیاتِ نثر مشکبو اعنی پنج آہنگ و مہر نیم روز و دستنبو کہ در سلامت و متانت عبارت لاجواب و بے مثال ست در مطبعِ آفاق مرجع عالی جناب فیض مآب ابرِ مطیر سخاوت، جوہرِ شمشیر شجاعت صاحبِ خلق و مروت جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہ خوشخط و عمدہ بہ نہایت تصحیح و تنقیح بسعی کارگزاران مطبع موصوف بماہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق شہر رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ لباس انطباع پوشیدہ مرغوب انام و مطبوع خواص و عام گردید۔ فقط

قطعہ تاریخ الراقمہ

زہے ایں نثر غالب — کہ شد مسرورِ ہر طبع ز طبعش
رقم زد عیش سال از روئے انصاف — بود مطبوع دلہا نثر دل کش

۱ ۲ ۸ ۴ ہجری

اودھ اخبار مورخہ ۲۸ جنوری ۱۸۶۳ء (صفحہ ۸) میں مرزا غالب کے شاگرد مردان علی خاں رعنا کا مضمون "چھیڑ چھاڑ کی تحریر" ہے۔ اسی اشاعت میں امیراللہ تسلیم شاگرد نسیم دہلوی کی تحریر ہے۔ اس کا عنوان ہے "جواب اعتراضات لالہ جواہر سنگھ جوہر"۔

اودھ اخبار مطبوعہ ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء (صفحہ ۱۰۳) جلد ۵ نمبر ۶۱

اس شمارے میں جوہر کا ایک خط مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے قطعۂ تاریخ کی اغلاط میں منشی نولکشور کے نام چھپا ہے۔ اسی صفحے میں منشی صاحب کا ذیل کا جواب بھی درج ہے:

"ہم الطاف نامۂ جوہر صاحب کے درج کرنے سے کمال خوش ہیں۔ ہم کو بحث علمی کے اندراج سے شکایت کا کیا منصب تھا۔ لیکن یقیناً نتیجۂ بحث علمی نوبت بہ نفسانیت ہو جاتی ہے۔ اگر سلامت روی حرف و تجاوز بہ نفسانیت نہ ہو، مضائقہ نہیں۔ بہ مطبوع خاطر اس کی اشاعت میں احباب کی خوشی اور اس کو باعثِ افتخار اخبار جانتے ہیں۔"

اسی شمارہ کے صفحہ ۱۱۰ میں غالب کے شاگرد نواب شہاب الدین احمد خاں تخلص ثاقب فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے بیٹے کی تاریخ ولادت منشی نولکشور کی اس طرح درج ہے :۔

بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست

" ۴ شعبان المبارک ۱۲۷۹ ہجری مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۶۳ء وقت شام روز شنبہ کو نواب والا شان منبع الجود والاحسان مخدومی مکرمی جناب نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر خلف الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کہ جن کا خاندان اظہر من الشمس ہے اور راقم کو بھی اس خاندان سے نیاز و عقیدت ہے ۔ زمان حمید و آوان سعید میں صاحبزادۂ بلند اقبالِ فرخ فال پیدا ہوا "

اودھ اخبار مورخہ ۱۸ مارچ ۱۸۶۳ء صفحہ ۲۰۱

اس شمارے میں غالب کے شاگرد مردان علی خاں رعنا کی ایک نایاب کتاب "غنچۂ راگ" کا تفصیلی اشتہار چھپا ہے ۔ "غنچۂ راگ" کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے سال ۱۲۷۹ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔ کتاب علم موسیقی پر ایک اہم تصنیف ہے ۔

اودھ اخبار مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء صفحہ ۳۶۷

اس میں سید غلام حسنین قدر بلگرامی شاگرد غالب کی مثنوی " قضا و قدر" کی طباعت کا اشتہار ہے ۔

اودھ اخبار مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۶۳ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۸۰ھ صفحہ ۵۶۲

اس پرچہ میں مرزا یوسف علی خاں عزیز شاگرد غالب کا " قطعہ و باھیہ" درج ہے ۔ اس میں ۴۳ شعر ہیں ۔ ابتداء میں منشی نولکشور کی تحریر بھی ہے ۔

اودھ اخبار مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۳ء صفحہ ۸۲۴

اس میں مردان علی خاں رعنا شاگرد غالب نے مرزا غالب کے ممدوح لارڈ ایلجن کی تاریخ وفات کا قطعہ لکھا ہے ؎

در عہد جناب لارڈ ایلجن — چو گشت عیاں قتال مغرب
از سال وفات او سروشم — فرمود بگو "جدال مغرب" ۱۲۸۰ھ

اسی شمارے میں ثاقب شاگرد غالب کی ایک غزل ۱۰ شعر میں ہے ۔ مطلع اور مقطع یہ ہیں ؎

اس کو بہلائے کوئی حرفۂ دیدار کے ساتھ — دیکھ سکتا ہو جو روزن تری دیوار کے ساتھ
خواہش وصل میں ثاقب کی کوئی دیکھے سیر — کچھ دعائیں بھی پڑھی جاتی ہیں اشعار کے ساتھ

اودھ اخبار، مورخہ ۳ر جنوری ۱۸۶۵ء، صفحہ ۴

منشی جواہر سنگھ تخلص جوہر تحصیلدار لکھنؤ کی ایک نظم "تحفۂ نمائش گاہ ملک اودھ" کے عنوان سے ۴۵ شعر میں چھپی ہے۔ جوہر تخلص کے دو شاعر تھے۔ دونوں ہم نام بھی تھے اور لکھنؤ میں تحصیلدار تھے ایک جوہر مرزا غالب کے شاگرد تھے ان کے والد رائے چھجو مل غالب کے بہت قدرداں تھے۔ غالب کے دیوان فارسی کا سب سے پرانا قلمی نسخہ جواب تک منظر عام پر آچکا ہے اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے انھیں رائے چھجو مل کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۲۵۳ ہجری (۱۸۳۷ء) میں لکھا گیا تھا۔ موصوف کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں ہوا۔ غالب نے تاریخ کہی۔ "بسا دریغ"، مادۂ تاریخ ہے۔ دوسرے جوہر گل محمد خاں ناطق کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۱۰ھ میں ہوا۔ زیر نظر نظم ان کے دیوان میں موجود نہیں۔ غالباً یہ غالب کے شاگرد جوہر کی تصنیف ہے۔ جناب مالک رام صاحب کو ان جوہر کا کوئی اردو شعر دستیاب نہ ہو سکا۔ مزید تحقیق کے لیے نظم سے پہلا اور آخری شعر پیش خدمت ہیں۔

واہ کیا اچھا ہوا میلا نمائش گاہ کا — کس قدر دلچسپ ہے جلسا نمائش گاہ کا
بست و چارم سے دسمبر کی یہ ہے دس دن تک — لاکھ عشروں سے ہے خوش عشرہ نمائش گاہ کا

غالب کی کتاب "باغ دو در" میں جوہر کے نام ۱۳ فارسی خطوط موجود ہیں۔

اودھ اخبار۔ بابت ۲۱ر فروری ۱۸۶۵ء، صفحہ ۱۴۵

اس شمارے میں مولانا محمد ہادی علی تخلص اشک کی تاریخ وفات درج ہے۔ موصوف مطبع اودھ اخبار لکھنؤ کے کارپردازوں میں ممتاز تھے۔ جب ۱۸۶۲ء میں منشی نولکشور نے کلیاتِ غالب کی طباعت ملتوی کر دی تھی تو اس کی وجہ مولانا کی بیماری ہی تھی۔ دریں اثنا غالب مولانا کی خیر و عافیت برابر پوچھا کرتے تھے۔ موصوف کی وفات پر مرزا تفتہ شاگرد غالب نے ذیل کی تاریخ کہی ہے

مولوی ہادی علی اشک از جہاں رفت و مرا — اندوہش در سینہ جا گیر و غمش در دل خزد
پس جز ایں دیگر چہ تاریخش نو سیم تفتہ من — رحلت ہادی علی اشک از جہاں جانم گرد

(۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء)

اس زمانے میں مرزا تفتہ لکھنؤ میں منشی نولکشور کے مہمان تھے۔

اودھ اخبار جلد ۷ نمبر ۳ (صفحہ ۲۱۹) مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۶۵ء مطابق ۲۹ شوال ۱۲۸۱ھ بروز سہ شنبہ۔

مولوی نجف علی خاں غالب کے مداحوں میں تھے۔ انھوں نے غالب کی قاطع برہان کی حمایت میں "دافع ہذیان" لکھی۔ مولوی صاحب نے "دساتیر" کی شرح "سفرنگ دساتیر" کے نام سے ۱۸۶۵ء میں شائع کی۔ اس پر غالب نے تقریظ لکھی جو "باغ دودر" میں شامل ہے۔
مذکورہ شمارہ میں "سفرنگ دساتیر" پر ذیل کا اشتہار درج ہے:

"اہلِ خرد کو مژدہ ہو کہ کتاب دساتیر کی شرح تصنیف کی ہوئی اشرف الفضلا مولوی نجف علی خاں صاحب قاضی زادہ، جھجھر کی (جن کی تصنیف ہر علم میں قابلِ تحسین ہے، چنانچہ شرح غیر منقوط ان کی مقامات حریری پر قریب سو جزکے ہے علی الخصوص دری اور پاژندی زبان کو موبدان زردشتی سے سیکھا) طبع ہو کر مع عبارت دساتیر کے بانسخۂ دساتیر کی احتیاج باقی نہ رہے۔ واقع شہر دہلی بلی ماروں کے محلّے میں حکیم محمد حسن مرحوم کے مکان میں نواب محمد حسین خاں عرف چھوٹے مرزا صاحب کے پاس موجود ہیں۔ شرح اس کی قیمت کی مع محصول ڈاک کے ایک روپے دو آنہ ہے..."

اودھ اخبار نمبر ۱۸ جلد ۷ مورخہ ۲ رمئی ۱۸۶۵ء مطابق ۵ ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ روز سہ شنبہ صفحہ ۲۹۸ کالم ۱

نواب مرزا اسداللہ خان بہادر غالب دہلوی۔ نقل مکتوب جناب معلی القاب زبدۂ اولاد حضرت خاتم المرسلینؐ بحر موّاجِ علم ویقین، مولانا و بالفضل اولینا ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں بہادر بنام نامی فخر المتاخرین وارث منطقِ ایران زمین، رشک عرفی وفخر طالب، مولانا اسداللہ خاں غالب۔

سرنامہ

بعونہ تعالیٰ در شاہ جہاں آباد بسامی مطالعہ فخر زمان وزمانیان نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اسداللہ خاں بہادر غالب تخلص، عرف مرزا نوشہ سلمہ اللہ والبقاہ موصول باد۔ راقم آنم سید رجب علی عفی عنہ از جگرانواں۔ یازدہ اپریل

۱۸۶۵ء ٹکٹ چسپانیدہ شد۔

عبارتِ مکتوب

ھو المستعان فی کلّ حین و آن   لائح خاطر اشتراقات مظاہرہ

تابان اخترِ سپہرِ فصاحت، درخشاں نیّرِ سما، بلاغت، فروغِ انجمن ہمہ دانان، مسلّم الثبوت ہفت زبانان، آرائش دستادۂ فارسیان، مصداق انّ من الشعر لحکمۃ و انّ من البیان لسحر، دریں زمان غالب الشعراء و میرزا میرزایان حصّل اللہ مرامہ، و اعلی اللہ مقامہٗ بعد از سلامی کہ مدِّ سنیش از ایوانِ کیوان برتر باشد و شوقی کہ در وسعت آباد چرخِ اطلس نگنجد، واضح باد کہ قاطع برہان را از آغاز تا انجام دیدم۔ سوگند برابطہٗ کہ در دلہائے ایمانیان باہم دگر از روزِ اوّل مستحکم و مشیّد کردہ اند۔ از تحقیقات و تدقیقاتِ آں یگانہ گوہر دریائے معنی حظّی برداشتہ ام کہ خامہ از شرحش بوجوہ قاصر، سیّما، افاداتِ طبعِ نقّاد و ذہنِ وقّاد کہ در خاتمہ بقالبِ عباراتِ سحر آیات ریختہ اند و خاصّتہً نکاتِ وزانہٗ ہرمزدِ ثم عبدالصّمد و شعرِ نظیری کہ حسبِ حالِ خود نوشتہ اند۔ زفلک آمدہ بودی۔ چو مسیح الخ خواندہ، دلم بدرد آمد، و جوالش اینکہ اگرچہ ہرزہ گردانِ کوئے سفاہت را کہ سعادت مساعدِ ایں طائفہ نشدہ باشد، راہِ حسد بیہودہ باشند۔ محلِ تردّد نیست کہ نفرت از خورشیدِ درخشاں مانعِ افاضۂ انوارش تواند شد و کم مایۂ دون فطرت کہ از عروج براوجِ افلاکِ معانی بہ مراحل پست بودہ باشد، بسانِ کدو بگمان سربزرگی خود با سروِ باغ ارم دعوی برابری کند، در نگاہِ مایہ شناسان چہ قدر رسوا شدہ باشد۔ حسبِ حال آں علوی خیال این ست ؎

خاقانی! آنکساں کہ براہِ تو می روند
زاغ اند و زاغ را روشِ کبک آرزوست
گیرم کہ مار چوبہ کند تن بہ شکلِ مار
کو زہر بہرِ دشمن و کو مہرہ بہرِ دوست

حرف ناشناسِ بے سعادت اعتراض بر "بوالہوس" کردہ، شگفت بوالہواسی بر روئے کار آوردہ۔ شرحِ عبدالواسع ہانسوی بر بوستان ہم ندیدہ۔ او فقط "بوالہواس" را از اغلاط نساخ گفتہ۔ بل بلا و او بمعنی بسیار نوشتہ۔ دامنِ قاتلِ من درست و دامان آلِ رسولؐ را بنا درستیِ ترکیبِ عربی و فارسی از تہمت بوالہوس بمعنیِ کثبت پاک داشتہ۔

فاضل وحید العصر، فرید الدہر مولوی نجف علی خان دفع ہرزہ سرائی معترض در شرح معنی آیات، چنانچہ می بایست کردہ وسیف الحق در لطائف غیبی، شمشیری کشیدہ کہ از زبانہ اش سنگ خارا خاکستر می شود۔ حال مورو چہ بودہ باشد۔ در قاطع برہان اکثر بیان غلطی ہا چناں دیدم کہ زعفران زار خندہ حضار را بوجد آورد۔ وتاب وطاقتِ خواندن نماند۔ منجملہ آں در لفظ قافلہ سالار رقت وبعدش انچہ نوشتہ اند معاذ اللہ نسبت بہ وفات حضرتِ قاب قوسین مرتبت صلوٰت اللہ علیہ وآلہٖ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ قلم ایں وقت ہم از بیانش از دست می افتد عجب خبطی وطرفہ مالیخولیائے است۔ استغفر اللہ، نعت ماہوچی شمۂ خضر تفصیلی کہ دریں باب کردہ اند، بخدا کہ اگر طابع کتاب ایں صنعت را بکار بعد، ایں شعر بحالش صادق ؎

من و مربّی من ہر دو آنچناں مجہول
کہ ہر دو را دو مربّی خوب می باید

وطرّہ برہمہ مہلنداست۔ دریں بارہ جوابِ آنجناب صحیح بہ زبان بزہ دیوان کوہ قاف باشد۔ از فرطِ خندہ سرشارم۔ پس لغزشِ قلم را معذور خواہند داشت۔

دو غلطی کہ از اں مکرّم در تمام ایں کتاب در اشتقاق و اشتراک بوقوع آمدہ، برسبیل شذوذ و ندور است وقابل التفات نیست۔ چہ انکہ در کتاب دُرۃ الغواص فی اغلاط الخواص غلطی ہائے علمائے متبحّر درج است۔ منجملہ آں لفظ جُدّہ بضم جیم است کہ دو منزل ایں طرف از مکّہ معظّمہ زاد اللہ شرفاً وتعظیماً بر ساحلِ دریائے شور است و اکثر علماء و فضلائے عرب وعجم و ہند جَدّہ بفتح جیم بہ تلفظ می آرند و می گویند کہ قبر حضرت حوّا در آنجاست کہ نسبت بہر انسان جَدّہ است۔ بفتح جیم باید خواند و عند التحقیق غلط است۔ وایں کتاب نزدم موجود و از یں جنس دراں مندرج۔ لیکن کثرتی کہ دکنی در اغلاط بطار بردہ، مصداق الاکثر حکم الکل است وطوریکہ اں مکرم سر رشتۂ لغاتِ واہیہ برہان قاطع را براہین متین قطع کردہ اند۔ ناطقہ را یارائے شرحش نیست کہ حظ وجدانی است۔

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

للّٰہ درکم والسلام علیکم وقلبی لدیکم۔

چہارم ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق یازدہم اپریل سنہ حال۔ مقام جگرانوں ضلع لدھیانہ۔"

مرزا غالب کا انتقال فروری ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ اودھ اخبار میں متعدد لوگوں کی تاریخیں چھپی ہیں۔ جن شماروں میں یہ تاریخیں دستیاب ہوئیں بعض ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

اودھ اخبار لکھنؤ جلد ۱۱ مطبوعہ ۱۵ جون ۱۸۶۹ء

صفحہ ۵۷۲۔ قطعۂ تاریخ میرزا غالب طبعزاد ماسٹر مظہر الحق مظہر تخلص

حیف صد حیف میرزا غالب　　حیف آں انوریِ ثانی حیف

بُد ز ذی قعدہ دوی تاریخ　　شد بہ جنت ز دارِ فانی حیف

اوستادِ شفیق بود مرا　　شد باوٗ بار زندگانی حیف

من چہ گویم جہاں ہمی گریدہ　　ہر کسے کرد نوحہ خوانی حیف

یاسمیں گشت سرخ و ہم گل را　　شد قبا، جامۂ کتانی حیف

گفت مظہر، کنوں ز روے الم

حیف آں خسروِ معانی حیف

۱۲۸۵ھ

صفحہ ۵۷۷ میں حالی کا مرثیہ اور قطعۂ تاریخ درج ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ پھر غالب کے شاگرد میاں داد خان سیاح کی تاریخ اس طرح ہے ؎

نہ مُرد آہ غالب کہ بُد فخر ہند　　ز جسم جہاں بلکہ رفتہ ست جاں

رقم کرد سیاح سالش چنیں　　چو شد امر حق دفعتہً داد جاں

اودھ اخبار۔ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۹ء۔ صفحہ ۱۱۰۱

قطعات تاریخ

اس ہفتہ ہمارے کرم فرمائے دیرینہ مورخ بے مثال، شاعر باکمال، منشی ہرگوپال صاحب المتخلص بہ تفتہ نے چند مادّہ تاریخ وفات مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم اس دفتر میں بارشاد طبع بھیجے۔ اگرچہ قطعات ہٰذا سابق ازیں اخبارات دیگر میں درج ہو چکے ہیں مگر بپاس ارشاد جناب موصوف بطرز قند مکرر اودھ اخبار میں چھاپے جاتے ہیں۔ وھو ھٰذا ؎

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے　　ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے

فضل و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق　　چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

۱۲۸۵ ہجری

اس کے بعد تین فارسی قطعات درج ہوئے ہیں۔

اودھ اخبار، مورخہ ۷ر دسمبر ۱۸۶۹ء صفحہ ۱۱۸۸

اس صفحے میں معین الدین حسن نے غالب کی اولادوں (نواب زین العابدین عارف کے صاحبزادوں نواب باقر علی خاں اور نواب حسین علی خان) کے نام غالب کی وفات پر نثر میں تعزیت نامہ لکھا۔ خط کے ہر فقرے سے ۱۲۸۵ ہجری کے اعداد نکلتے ہیں۔

تاریخ وفات

آج بجا باقر علی خان اندوہ گیں ہیں اور حسین علی خان اب قالب بے جان

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

پھر کیوں کر دل آزاد معین الدین حسن آرام میں ۔ ہے ہے کیا شکایت لکھوں فلک پیری

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

آج کیسا بڑا سرپرست چلا گیا ۔ یہ اب کیسا سخت ملال ہے ۔ ہائے وہ ہمکلام

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

فردوسی خاقانی ۔ یکتائے جہان سخن دانی بلبل شیراز۔ کشادہ پیشانی شگفتہ رو ارباب نیاز

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

دیدۂ حقیقت شناس معانی ہیں ۔ مہجور خاک نشیں ۔ وآہ شاہ سخنوراں ۔ تصریح بلبل بستاں

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

خورشید جلوہ کناں ۔ جلوہ گر فخر عالم ۔ مدیر دفتر دانش ۔ روشناس ارباب بنیش

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

تصویر فصاحت ۔ صدر نشین فصاحت ۔ رسول اشک حسرت ۔ سخن سراپا ہوش

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

فرد فیض عالم ۔ مخزن نکتہ سنج ۔ مخازن معلومات ۔ ملک الشعراء صاحب کمالات

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

شرف داشت ۔ کرسی نشین مستفاد ۔ انسان دوست دار اہل بیت ۔ منظوم دریا دل

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

نخل عمر نامراد ۔ دم سرد تشنہ جگر ۔ حسرت خیز ۔ آہ آہ وا حسرتا ماتم اسداللہ ہے

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

وائے افسوس ختم ہوئی ۔ بہار جلوہ غالب ۔ آہ غالب بمرد ۔ آہ راہی اسداللہ ہے خلد بریں کا

۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ ۱۲۸۵ھ

کاتب الحروف معین الدین حسن

۱۲۸۵ھ

حوالے اور حاشیے

۱؎ کلیات نثر غالب مطبوعہ منشی نولکشور ۔ ۱۸۶۸ء ۔ کتب خانہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنؤ۔

۲؎ اردوئے معلیٰ ص۱۴۱ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء

۳؎ خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد صفحہ ۱۱۱ ، ۴؎ ایضاً ، صفحہ ۱۶۱

۵؎ ایضاً صفحہ ۱۱۲ ، ۶؎ اردوئے معلیٰ ص۳۰۵

۷؎ ایضاً صفحہ ۱۶۲

۸؎ خطوط غالب صفحہ ۳۳۵ از مہیش پرشاد

۹؎ سید رجب علی خاں ۔ خان بہادر ارسطو جاہ خطاب ۔ ابن سید علی بخش ۔ ارسطو جاہ جگراؤں ضلع لدھیانہ میں ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ میں حاصل کی ۔ ۲۵ برس کی عمر میں دہلی گئے اور مفتی صدرالدین خان آزردہ کے مدرسے میں مزید تعلیم حاصل کی ۔ ترقی کرتے کرتے لارڈ لارنس گورنر پنجاب نے میر منشی کے عہدہ پر ممتاز کیا ۔ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں فریضۂ حج ادا کیا ۔ ۷۵ برس کی عمر میں ۲۰ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) کو جگراؤں میں انتقال کیا ۔ تاریخ وفات یہ ہے ؎

جاہ است لقب پس ارسطو　　مولد پنجاب اہل ایماں
از دہر جو رفت گفت جعفر　　راہی جناں رجب علی خاں

ارسطو جاہ اور مرزا غالب کے تعلقات نہایت استوار تھے ۔ غالب ان کی غیر معمولی قابلیت اور جوہر شناسی کے مداح تھے اور ان کی تفسیر ہل اتیٰ اور تفسیر سورۂ والنجم کی بے حد تعریف

کی۔ ارسطو جاہ عالم جیّد اور فاضل یگانہ تھے۔ عربی اور فارسی علوم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی عظمت و بزرگی کا اندازہ غالب کی کتاب "باغ دودر" (سال تصنیف ۱۲۸۳ھ) سے ہو سکتا ہے۔ غالب ارسطو جاہ کے بارے میں اپنے شاگرد جواہر سنگھ جوہر کو لکھتے ہیں:

(۱) مولوی سید رجب علی خان جن سے اب تمھاری امیدیں وابستہ ہیں۔ شرافت و مروّت کی روح رواں ہیں۔

(۲) میں تمھیں دیوان (فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء) بھیج دوں گا۔ تاکہ میری طرف سے حضرت مولانا سید رجب علی کی خدمت میں پیش کر کے میری عقیدت کا اظہار کر سکو۔

(۳) حضرت مولوی معنوی سید رجب علی خاں بہادر کا دامن مضبوط پکڑے رہو قسم بخدا یہ یگانۂ روزگار، مروّت و شرافت و سخاوت میں پروردگارِ عالم کی نشانیوں میں سے ہیں۔

(۴) تمھیں میری قسم ہے کہ جب یہ خط تمھیں ملے تو پڑھنے کے بعد آستین میں رکھ کر مولوی سید رجب علی خاں بہادر کی خدمت میں لے جانا۔ میرا سلام بصد ہزار اشتیاق دیدار اور بصد ہزار تمنائے زیارت پہنچانا اور یہ خط میرے اس مخدوم قدسی صفات کے ملاحظہ میں لانا اور درخواست کرنا کہ از اوّل تا آخر پڑھ لیں تاکہ میری ارادت و عقیدت کا اندازہ کر سکیں۔

(۵) تم نے جو لکھا کہ مولوی سید رجب علی خان بہادر کا مسلک و مشرب حیدر پرستی و حیدر ستائی ہے تو یہ لکھ کر گو مجھے ان کا بندۂ بے دام بنا دیا اور میرے دل میں ان کی محبت کا چراغ جلا دیا۔

(۶) تم جانتے ہو کہ میں بندۂ علی ابن ابی طالبؑ ہوں اور جسے سنتا ہوں کہ ان کا بندہ ہے اسے اپنا آقا و خداوند سمجھتا ہوں اور اس کا حلقہ بگوش ہو جاتا ہوں۔

(۷) اوّل میرے مخدوم کی خیر و عافیت لکھو اور یہ لکھو کہ اس خط کے ملاحظہ کے بعد انھوں نے دعا و سلام کے طور پر کیا ارشاد فرمایا۔

(۸) سیدی و مولائی سید رجب علی خان بہادر کی انجمن میں باریابی ہو تو میری طرف سے کورنش اور تسلیم عرض کرنا (باغ دودر مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی مطبوعہ

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۰ء)

۱۱ منظہر الحق۔ حاجی محمد اسحاق نام عرف منظہر الحق خلف ظہور علی شاگردِ غالب۔ غالب نے منظہر کا ذکر اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ منظہر تنقیدی ذوق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ایک مبسوط مضمون یعنی "ریویو" میر حسن کی سحر البیانی اور گلزار نسیم پر لکھا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب چکبست اور شرر کے درمیان مثنوی گلزار نسیم پر بحث چھڑ گئی اور گویا جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ تو منشی سعید اللہ خاں ایڈیٹر "تہذیب" رامپور نے اس مضمون کو جنوری ۱۹۰۵ء میں قولِ فیصل کے طور پر شائع کیا۔ مضمون راقم کی نظر سے گزرا ہے۔

قومی اُردو کونسل کی مطبوعات

دیوناگری اور تصویروں کی مدد سے اُردو سکھانے والی کتاب

اُردو تصویری لغت مع ہندی

جدید طریقوں سے بنائی گئی کتاب اُردو سیکھنے کے شوقین حضرات کے لیے نہایت عمدہ تحفہ۔ تصاویر اور ہندی کی مدد سے اُردو خود بخود سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اپنی طرز کی بالکل اچھوتی کتاب ہے۔ بہترین کتابت اور آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ۔

قیمت : -/30 روپے

سائز : 23x38/8

صفحات : 252

کتب فروش اور کتب خانوں کے لیے اسپیشل کمیشن، آرڈر فوراً ارسال کریں۔

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ا، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 006

فون : 6103381, 6103938, 6179657 : فیکس : 6108159

حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد۔500002

اے۔ آر۔ فتیحی

کثیر لسانی پس منظر میں
اردو طبقے کا لسانی اندازِ فکر

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو بولنے والے طبقے کے لسانی رجحانات کا مطالعہ دراصل ایک اقلیتی لسانی گروہ کے احساسات کا حاصل تجزیہ ہے۔ زبان کی شناخت سے ان کی وابستگی اور ان کے مثبت لسانی رویّے کی تشکیل کے پس پردہ اُن کا یہ خوف کارفرما رہا ہے کہ اُن خطوں میں جہاں کہ اردو بولنے والے موجود ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اکثریتی لسانی گروہ اپنی زبان اور ثقافت کے اعتبار سے غلبہ حاصل کرلیں۔ چنانچہ اقلیتی لسانی گروہ کی زبان کے تئیں رجحانات سے اس گروہ کے افکار، عقائد، ترجیحات اور خواہشات کا پتہ چلتا ہے، اور اس کے ذریعے زبان کی صحت کا پیمانہ بھی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس تناظر میں زیرِ نظر مقالہ اردو بولنے والے طبقے کی زبان کے تئیں اندازِ فکر، شناخت، رکھ رکھاؤ کے محرکات کو سمجھنے میں دلچسپ مواد ثابت ہوگا۔ اس مطالعے کے ذریعے اردو بولنے والی برادری کے لیے شناخت کی ایک علامت کے طور پر اردو کی اہمیت واضح کی گئی۔

مفروضات:

لسانی رویّے کے اس مطالعے کے پسِ پردہ بہت سے مفروضات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ جس خطے میں اردو بولی جاتی ہے وہاں کی زبان میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کا تعلق بنیادی طور پر اعلا طبقے کی زبان اور نچلے طبقے کی زبان سے ہے۔ مثال کے طور پر جس خطے میں ہندی بولی جاتی ہے، اس میں ہندی اور اردو

ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں لیکن ان کا استعمال، ان کی شناخت کے تعلق سے پایا جانے والا فرق، ان کی تاریخ اور ان زبانوں کے بولنے والوں کا ان کے تئیں رویّہ، ان سب سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان دونوں کا تعلق محض دو زبانوں کا تعلق ہی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق دو زبانوں کے درمیان ایسا عملی فرق ظاہر کرتا ہے جس سے کہ ایک نوع کے افراد زبان کے استعمال کے حوالے سے دوسرے نوع کے افراد سے مختلف گوشوں میں مقابلتاً خود کو بلند تر سمجھتے ہیں۔

مزید برآں دوآبہ میں لسانی فرق بنیادی طور پر دو زبانوں کا فرق تصور کیا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرق ایک ایسے باضابطہ نظام کے تحت ترتیب پاتا ہے جسے جچا تلا اور تجزیہ شدہ نظام کہہ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اعداد و شمار جمع کرنے کا بنیادی ذریعہ شخصی نوعیت کے انٹرویو تھے اور سروے کے لیے ایک سوالنامہ لوگوں کو دے دیا گیا تھا۔ یہ سوال مردوں اور عورتوں پر مشتمل عوام سے کیے گئے جن میں ان کی زبان کے پس منظر، اردو میں ان کی صلاحیت، زبان کے استعمال اور زبان کے تئیں ان کے رجحانات کے بارے میں پوچھا گیا۔ یہاں ایک بنیادی مفروضہ کارفرما رہا اور وہ یہ کہ اس نوعیت کی از خود ترتیب دی گئیں۔ رپورٹیں سماجی اور لسانی رویّوں سے مربوط تھیں۔ جوشوا فش مین (۱۹۶۹ء) نے اس طرف بجا طور پر اشارہ کیا ہے کہ سماجی و لسانی مطالعوں میں از خود ترتیب دی گئیں ایسی رپورٹیں غیر معتبر ہو سکتی ہیں کیونکہ جن لوگوں نے ان سوالوں کے جوابات دیے، انھوں نے یہ جواب انٹرویو لینے والے کی امیدوں کے پیمانے کو سامنے رکھ کر دیے یا پھر یہ وہ شخص تھا جو اپنی زبان کے استعمال کے بارے میں پوری طرح واقف نہ تھا اور وہ اس قدر اہل نہ تھا یا اس کا رویّہ ایسا نہ تھا کہ وہ ان سوالوں کا جواب صحیح صحیح دے سکتا۔ البتہ فش مین کا مطالعہ یہ بھی ہے کہ از خود رپورٹیں مرتب کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر آبادی کے اس طبقے میں ملے گی جہاں زبان کو سیاست سے جوڑ دیا گیا ہے اور جہاں زبان کے سلسلے میں نظریہ پرستی اختیار کر لی گئی ہے۔

ہندی کی پٹی میں، اردو زبان کا مسئلہ عوام کے سامنے کئی دہوں سے چلا آرہا

ہے اور اردو بولنے والے اپنی زبان کے مسئلے کے تئیں بہت بیدار ہیں۔ دیہی اور شہری آبادی کو زبان سے متعلق بہت سے مسائل کا سامنا ہے اور یہ مسائل تسلسل کے ساتھ چلے آ رہے ہیں مثلاً اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم، مدرسہ کی تعلیم، اردو اور ہندی کی آمیزش، اردو تحریک سیاسی وعدے بشمول زبان کے مسائل۔ اس کے نتیجے میں ان مسائل کا مطالعہ ضروری ہے۔ انٹرویو کی مدد سے از خود رپورٹنگ کے ذریعے اس مطالعے کو ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ زبان کے تئیں رویّے اور رجحانات یقینی طور پر دیگر سماجی اور لسانی تغیر پذیری کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ زبان کے استعمال کا طرز ایک ایسے عبوری مرحلے سے گزر رہا ہے جس میں رابطۂ عامہ کے سابقہ مسلّمہ اصول بدلتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب اور اسلامی دینیات کے شعبے اردو زبان کی قلمرو کے شعبے سمجھے جاتے تھے، مگر اب یہ ہندی کے دائرے میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندی کی پٹی میں ان شعبوں میں بھی ہندی استعمال ہو رہی ہے۔ اسی طرح کچھ اور لسانی پس منظروں میں بھی ہندی واحد مناسب زبان خیال کی گئی ہے اب اس طرز میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اس نئی صورت حال میں اردو/ہندی بولنے والے کو اپنے طور پر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہندی استعمال کرے یا اردو۔ ایسا کرتے وقت مسلّمہ سماجی و لسانی سابقہ رویّے اس راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ ایسی صورت میں ہر دو زبان کے تئیں انفرادی رویّے ہی زبان کے انتخابات کے تعین میں فیصلہ کن رول ادا کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اس خطے میں ہندی۔ اردو تعلقات کو سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے اور یہ اس حد تک راہ پا گیا ہے کہ اس کے امکانات واضح ہو گئے ہیں کہ زبانوں کے تئیں انداز فکر سے ایک ایسی تحریک پذیر اثر سامنے آ سکے جس سے کہ کسی کی بھی زبان کے انتخاب کی حدود اور مقدار متاثر ہو سکتی ہیں۔ زبان کے تحریکات اور جد وجہد میں رجحانات اور رویّوں کے کردار کی اہم مثالیں سامنے آئی ہیں جس کے زیر اثر زبان کے استعمال کا احیاء ہوتا ہے یا پھر اس کی توسیع ہوتی ہے۔

ٹیلی ویژن کے نمایاں ترین اثرات کے پیش نظر ہندی بولے جانے والے خطے میں زبان کی تغیر پذیری کی واضح تصویر سامنے آنے میں دشواری ہوگئی ہے۔ شہری علاقوں میں یہ تصویر اور بھی دھندلی ہے جہاں کہ تین بڑے لسانی گروہ ہیں۔ ایک وہ طبقہ جو ہندی کو اپنی بنیادی زبان سمجھتا ہے، دوسرا وہ طبقہ جو اردو کو اپنی بنیادی زبان خیال کرتا ہے اور ایک تھوڑا سا وہ طبقہ جو انگریزی کو بنیادی مانتا ہے! اس کثیر لسانی زبان دانی کے منظر نامے میں اردو کی قلمرو کے خط و خال توسیع پا گئے ہیں۔

حالیہ برسوں میں اردو ایک ایسی زبان کے طور پر اُبھری ہے جس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ اس کے تحفظ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کے برقرار رکھنے کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آئی اور اردو کی شناخت کے سوال نے زور پکڑا۔ البتہ پورے خطے میں اردو کے تئیں خدمت کا جذبہ یکساں طور پر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ آبادی کے مختلف طبقات میں اردو کے تئیں جذبۂ محبت اور عقیدت درجہ بدرجہ پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو اردو کے لیے خود کو وقف کر دینے کے جذبے سے کام کرتا ہے، وہ اردو پڑھتا ہے، اردو کی کتابیں خریدتا ہے، اردو رسائل خریدتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اردو، تعلیم کے تمام درجات میں باقاعدہ طور پر پڑھائی جائے۔

اردو کا ایک وہ طبقہ جسے زبان سے گہرا تعلق ہے اور وہ دیگر طبقے جو سماجی اور اقتصادی حیثیت سے نیز انسانی آبادی کے لحاظ سے تغیر پذیری کے زمرے میں آتے ہیں، ان کے باہمی ربط و ضبط کے تجزیے سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ان کے درمیان مثبت نوعیت کے تعلق کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

طرز مطالعہ:

اردو بولنے والوں کے زبان کے رویوں اور زبان کے استعمال کے بنیادی سروے کے خیال سے ایک مطالعہ کیا گیا۔ سروے کے لیے ایک سوالنامہ دیا گیا اور اس کو سامنے رکھ کر ہی یہ مطالعہ کیا گیا۔ اعداد و شمار جمع کرنے کی تکنیک کو ذاتی مشاہدات سے زیادہ مفید بنایا گیا۔ اسے اردو بولنے والے علاقوں میں سماجی و لسانی صورت حال کے لسانی پہلوؤں کے بارے میں ایک عام مفروضہ کو قائم کرنے کے سلسلے میں کام میں لایا گیا۔ مثلاً زبان کے ترتیبِ اجزا کا حلقۂ اثر، مخصوص حالات میں زبان کا انتخاب، اور ایسی

اقدار اور اوضاع جو زبان سے جڑی ہوں اور جو زبان کے تعلق سے کسی طرح کا کردار ادا کر رہی ہوں۔ سروے میں جمع کی گئی اعلامات کے جواز کے تعین کے لیے شخصی اور ذاتی مشاہدات سے بھی کام لیا گیا۔ سوالنامہ کا پہلا حصّہ ایسے سوالوں پر مشتمل تھا جن کے ذریعے سوال پوچھے جانے والے شخص کی بنیادی، سماجی و اقتصادی اور سماجی اور لسانی پس منظر کو معلوم کیا جا سکے چوں کہ یہ سوال ایسے تھے جو کہ اُس آبادی کے حالات کے اظہار سے مطابقت رکھتے تھے جس آبادی میں یہ سروے کیا جا رہا تھا۔ سوالنامہ کا دوسرا حصّہ ایسے سوالوں پر مشتمل تھا جس میں سوال پوچھے گئے شخص کی اردو کی صلاحیت اور لیاقت کا پتہ چلتا تھا اور مختلف شعبوں میں اردو کے استعمال کا اندازہ ہوتا تھا۔ سوالنامہ کا تیسرا حصّہ ایسے سوالوں سے بھرا تھا جن میں سوال پوچھے جانے والے شخص کے اردو کے بارے میں حالات و نظریات کا پتہ چلتا تھا۔ اس طرح کا سوال پوچھے جانے کا مقصد یہ تھا کہ یہ پتہ چلایا جائے کہ وہ آدمی اردو کے تئیں کتنا مخلص ہے۔

اس طرح کے کسی بھی مطالعے میں عوام کے اس طبقے کا تعاون جن سے کہ سوالات پوچھے جائیں، ضروری ہے۔ اردو خطوں میں اردو بولنے والوں کا تعاون بڑے پیمانے پر ملا۔ انھوں نے دوستانہ طریقے پر اس مطالعے سے دلچسپی لی۔ بہت سے وہ لوگ جن سے سوالات پوچھے جا رہے تھے، اس مطالعے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ کہیں کہیں اس سلسلے میں کچھ رکاوٹ اور ہچکچاہٹ بھی دیکھنے کو ملی۔ اس طرح کے لوگوں کو دو زمروں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہ یہ ردِ عمل ایک غیر متعلق شخص کے سوالوں کے جواب میں تھا جسے غیر معمولی طور پر سوال پوچھنے کے لیے درخواست کرنی پڑتی تھی۔ لوگوں کے اس انکار کے پس پردہ وہ خدشات بھی تھے جو بالعموم غیر متعلق لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اور زمرہ بھی تھا جس نے تعاون سے گریز بلکہ انکار کیا۔ اس کا تعلق براہ راست سروے کے موضوع سے تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس مطالعے کی نوعیت کے سلسلے میں غلط فہمی پائی جاتی تھی۔

نتائج کی پیش کش اور تجزیہ :

موجودہ مطالعہ کے نتائج کو چار عام نوعیت کے عنوانات کے تحت رکھا گیا ہے۔

(الف) زبان کے بارے میں ترجیح (ب) عوامی رابطے میں اردو کے استعمال کے بارے میں نظریات وخیالات (ج) تعلیم میں اردو کے استعمال کے بارے میں رجحانات اور خیالات (د) مجموعی تناظر میں اردو کے تئیں روّیے۔

ان نتائج کا تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ یہ پتہ چلایا جاسکے کہ اردو بولنے والوں کے زبان کے تئیں رجحانات کے سلسلے میں کیا خیالات ہیں اور زبان کے روّیے اور زبان کے استعمال کے درمیان تعلق کے سلسلے میں اردو بولنے والے کیا سوچتے ہیں؟ سماجی و لسانی پس منظر کے تفاوت کے نتائج سے اردو بولنے والوں کے لسانی روّیوں کی ساخت میں نمایاں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

زبان کی ترجیح کے سلسلے میں نظریات:

ایسے حالات میں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہوں، ضروری نہیں کہ وہاں کے لوگ تمام معلومہ زبانیں بولیں اور ایک ہی کام کی انجام دہی کے لیے سبھی زبانوں کا استعمال ہو۔ ایسے حالات میں زبانیں ایک دوسرے کے کام میں معاون ہوتی ہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہندی اپنے حلقے اور خطے میں ایک غالب اور بڑی زبان ہے، اس مطالعے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کیا اردو نے خاص زبان کا رول ادا کرنے کی وجہ سے ہندی کو پرے سرکا دیا ہے۔ مطالعے کے اس پہلو سے متعلق اعداد و شمار اخذ کرتے وقت سوال یہ پوچھا گیا کہ وہ ان زبانوں کے بارے میں بتائیں جن کو وہ ترجیح دیتے ہیں اور جن میں ان کی صلاحیت مسلّم ہے اور یہ ترجیح ترتیب وار لکھیں۔ موجودہ مطالعے میں ترجیحات کی اصطلاح سے یہ مراد لی گئی کہ مختلف قلمرو میں زبان کی پسند کے سلسلے میں ہر شخص اپنی رائے اور پسند کے مطابق جواب دے۔

اردو بولنے والے تین سماجی طبقے یعنی مقابلتاً برتر متوسط طبقہ یعنی اَپر مڈل کلاس، متوسط طبقہ اور مقابلتاً کمتر متوسط طبقہ، زبان کی پسند کے معاملے میں اپنی الگ الگ پسند کے مالک ہیں۔ اَپر مڈل کلاس انگریزی کو اوّلیت دیتا ہے اور اردو کو ثانوی اور ہندی کو تیسرے نمبر پر، متوسط طبقہ پورے طور پر اردو کا حامی ہے اور اسے پسند کرتا ہے۔ اس طبقے سے جو سوال پوچھے گئے، ان میں سے ۵۰ . ۱۷ فی صد نے اپنی پہلی ترجیح

اردو بتائی۔ مقابلتاً کمتر یعنی لوئر مڈل کلاس دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے پہلی ترجیح وہ اردو کو دیتی ہے اور دوسری ہندی کو۔

یہ تینوں طبقے بولتے اردو ہی ہیں۔ اَپر مڈل کلاس اردو بولنے والے تحریری سطح پر مختلف رجحان رکھتے ہیں۔ مڈل کلاس اور لوئر کلاس اردو بولنے والے تمام چاروں سطحوں پر اردو کا ہی دم بھرتے ہیں لیکن انگریزی کی صلاحیت کی سطح ہر طبقے کی جدا جدا ہے۔

مڈل کلاس (متوسط طبقے) اور لوئر مڈل کلاس (مقابلتاً متوسط طبقہ) میں تمام کی تمام چاروں سطحوں پر اردو کے باقی رہنے کی ایک اہم اور خاص وجہ غالباً یہ ہے کہ ان طبقوں کے بچے اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں جبکہ اَپر مڈل کلاس کے طلبا انگلس میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم رہتے ہیں۔ اَپر مڈل کلاس میں اردو بولنے والوں کی نئی نسل اردو موثر ڈھنگ سے نہ لکھ سکتی ہے، نہ پڑھ سکتی ہے۔ اردو میں خواندگی کے معیار میں کمی کا نمایاں سبب کچھ انھیں باتوں کی وجہ سے ہے۔

اردو کے ذریعے تعلیم کے تئیں اردو بولنے والے طبقے کے رجحانات:

اردو کے ذریعے تعلیم کے سلسلے میں اردو بولنے والے طبقے کے رجحانات کے تجزیے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اعلا سطح کی تعلیم کے سلسلے میں اردو کے ذریعے تعلیم کی مانگ بہت کم ہے۔ اردو بولنے والے جو پرائمری سطح کی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کرنے کے سلسلے میں اپنے بچوں کو بھیج دیتے ہیں، کھل کر اپنی پسند انگلش میڈیم اسکولوں کے تئیں ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو معلوم ہے کہ انگریزی کی تعلیم سے سماجی اور اقتصادی فائدے جڑے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ذریعہ تعلیم یا بطور ایک مضمون اردو کی تعلیم زبان میں مہارت اور زبان کی ترجیح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عام حالات میں اردو کی تعلیم ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جس سے کہ اردو میں تعلیم پانے کے خواہش مند لوگ اس زبان کا لکھنا اور پڑھنا موثر ڈھنگ سے سیکھ لیتے ہیں۔

اس مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو بطور ذریعۂ تعلیم ثانوی، انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کی سطح پر شکل ہی سے اپنی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ اعلا سطح کی تعلیم کے لیے اردو میں امتحانی سوالات حل کرنے کی سہولتیں مفقود ہیں

مثال کے طور پر اُتر پردیش میں انٹر میڈیٹ ایگزمینشن بورڈ نے ہائی اسکول یا انٹر میڈیٹ کی سطح پر اردو میں امتحان دینے کی سہولت نہیں رکھی۔ ان حالات میں لوئر مڈل اور مڈل کلاس کے طلبا جن کا تعلق اردو بولنے والے طبقے سے ہے، ہندی میڈیم اسکولوں میں تعلیم پانا پسند کرتے ہیں۔ شہری علاقوں میں ان طلبا کا رجحان انگریزی کی طرف ہوتا ہے۔ سماج میں انگریزی کو جو مقتدر درجہ حاصل ہے اس کے پیش نظر والدین اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بچّوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلوائیں۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ دیگر ریاستوں میں اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد حالیہ برسوں میں بڑھی ہے۔ بہار، بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک اور اندھرا پردیش میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ البتہ یہ وہ گوشہ ہے جہاں ابھی اور تحقیق کی جا سکتی ہے اور تعلیمی نیز سماجی و لسانی مضمرات کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس گوشے میں درج ذیل نکات کے حوالے سے مزید تحقیق ہو سکتی ہے۔

(الف) چونکہ اردو بولنے والی آبادی ہر ضلع میں جُدا جُدا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم کی سہولتوں کے بارے میں ضلع وار اطلاعات فراہم کی جائیں۔

(ب) اردو اور دیگر زبانوں کی تعلیمی مواد کا تقابلی اندازہ بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے اردو میں درسی مواد کے معیار کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

(ج) چونکہ اردو بولنے والے لڑکے ثانوی درجات کی سطح پر دوسری زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، لہٰذا پرائمری درجات کی سطح پر تعلیم دینے کے لیے مشترکہ زبان کے نصابات تیار ہونی چاہیے۔ ثانوی اور متوسط سطحوں پر جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اس زبان میں مہارت کم ہونے سے ایسے تعلیمی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن سے ایک طرف تو نصاب تعلیم کے تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں اور دوسری طرف ان طلبا کو ایسے لڑکوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جنھوں نے شروع ہی سے وہ زبان پڑھی ہو۔

(د) اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے کیونکہ اس سے اقلیتی اور اکثریتی لسانی گروہ کے درمیان مفاہمت کو فروغ ملتا ہے۔

سوالنامے میں جن لوگوں سے سوالات کیے گئے ان سے حاصل شدہ جوابات کے تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ۷۰ فی صد لوگوں کا مطالبہ یہی ہے کہ تعلیم کی ہر سطح پر اردو میڈیم اسکول ہونا چاہیے چونکہ اس سلسلے میں عمل درآمد کی دشواریاں دیکھنے میں آئی ہیں اس لیے وہ اپنے بچوں کو مدرسہ کی تعلیم دینے کے لیے ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے الگ سے شناخت قائم رکھنے کی ایک زبردست خواہش کارفرما ہے۔ ان میں سے ۳۰ فی صد لوگ جو اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مخالف ہیں، اس کے پس پردہ سماجی اور اقتصادی فائدے ہیں جن کی بنیاد پر وہ ایسے فیصلے کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو سماجی اور اقتصادی فائدوں کے ضمن میں کارآمد نہیں ہے پھر بھی بطور ایک مضمون وہ اسکولوں میں اس کی تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ جواب دینے والوں میں تقریباً سب کے سب وہ ہیں جو تعلیم کی ہر سطح پر اردو کی تعلیم دینے کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔

مختلف عمر کے زمروں کے نقطۂ نظر سے تعلیم میں اردو کے استعمال کے سلسلے میں ان کے اندازِ نظر پر کوئی واضح فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یونیورسٹی سطح پر اردو کے استعمال کے سلسلے میں ان کا رویّہ زمانے کے زیر اثر ہے۔ ان سوالوں کے جوابات مقابلتاً کم عمر لوگوں نے دیئے، انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کی سطح اردو کے ذریعہ دلانی ٹھیک نہیں ہے، البتہ عمر رسیدہ افراد میں سے چند منتخبہ لوگوں نے تعلیم کی ہر سطح پر اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہی مناسب سمجھا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پرانی نسل اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں زیادہ ہے۔

اردو بولنے والی عورتیں تعلیم میں اردو کے لیے زیادہ موافق انداز نظر رکھتی ہیں۔ تعلیم میں اردو کے لیے متوسط اور کم متوسط آمدنی کے زمروں کے افراد کا رجحان زیادہ ہے جب کہ بالائی متوسط آمدنی کے زمرے کے لوگوں میں یہ رجحان اتنا زیادہ نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ تعلیم میں اردو کے استعمال کے سلسلے میں اردو بولنے والی برادری کے روّیوں کے بارے میں درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

(الف) زیادہ تر اردو بولنے والے اردو میڈیم کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے

ہیں۔ اسی طرح متوسط طبقہ اورکمتر متوسط طبقہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلے میں مثبت انداز نظر رکھتا ہے۔

(ب) جہاں تک اردو بطور ایک مضمون تعلیم کی ہر سطح پر پڑھانے کا سوال ہے اس بارے میں سبھی اتفاق رائے رکھتے ہیں۔

(ج) اردو کے تئیں اردو بولنے والی برادری کا بحیثیت مجموعی رویہ، کم یا زیادہ عمر کے لوگوں میں ایک جیسا ہے۔ البتہ کم عمر لوگ اعلا سطح پر ذریعۂ تعلیم اردو کو بنانے کے حق میں زیادہ نہیں ہیں۔

عوامی رابطے میں اردو کے استعمال کے تئیں روّیہ:

عوامی رابطہ میں ماتحت زبانوں کا استعمال لسانی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور دیگر وجوہات کی بنا پر محدود ہوگیا ہے۔ البتہ پرنٹ میڈیا کا جہاں تک تعلق ہے اس میں اردو کا استعمال زیادہ ہے۔ مذکورہ تین سماجی زمروں میں یعنی مڈل کلاس، لوئر مڈل کلاس اور اَپر مڈل کلاس میں پرنٹ میڈیا کے تعلق سے زبان کی پسند کا معاملہ جُدا جُدا ہے۔ اپَر مڈل کلاس میں ہندی، اردو اخبارات کے مقابلے میں انگریزی نیشنل اخبارات زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ انگریزی اخبارات کے بعد اردو اخبارات کا نمبر ہے لیکن بلحاظ فی صد تناسب کافی نمایاں فرق ہے۔ اپَر مڈل کلاس میں کچھ لوگوں نے بتایا کہ وہ انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات بھی خریدتے ہیں اور وہ اس لیے کہ اردو سے انھیں جذباتی لگاؤ ہے۔ انگریزی زبان کے اخبارات انھیں اس لیے پسند ہیں چونکہ ان میں قومی اور بین الاقوامی خبریں زیادہ ہوتی ہیں۔

مڈل کلاس اردو بولنے والوں میں ۷۱ فی صد اردو اخبارات اور رسائل پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے مشمولات سے مطمئن نہیں ہیں مگر پھر بھی وہ اردو رسائل اور اخبارات ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ ان کو گھر کی عورتیں بھی پڑھ لیتی ہیں۔ لوئر مڈل کلاس میں ہندی اخبارات کی پسند ۵۱ فی صد تک پہنچ گئی ہے۔

ان اعداد و شمار کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ سماج کے ان تینوں طبقات میں اپنی اپنی پسند والا معاملہ ہے اور ہر نمونہ دوسرے سے مختلف ہے۔

بحیثیت مجموعی روّیہ:

اردو بولنے والے علاقے میں سماجی ولسانی صورت حال کے جائزے اور اندازے کے لیے ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اردو بولنے والوں کے اذہان میں اردو کا کیا مرتبہ ہے۔ یہ مفروضہ کہ اردو اپنے مرتبہ کے لحاظ سے ماتحت زبانوں کے ہم پلّہ ہے اردو بولنے والوں کے دیگر روّیوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں موصولہ جوابات کے تجزیوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو بولنے والوں کا تقریباً ۷۵ فی صد طبقہ یہ سوچتا ہے کہ اردو خطّے کی ماتحت زبانوں کے ساتھ ہمسر اور ہم پلّہ ایک زبان ہے۔ اس ایک سوال کے جواب میں کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اردو کی بقا اہم ہے، تقریباً سو فی صد جوابات اثبات میں تھے۔ البتہ ایک دوسرے سوال کے جواب میں کم ہی لوگوں نے اثبات میں جواب دیا اور وہ سوال یہ تھا کہ سیاسی لیڈروں اور پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والوں کو اردو بولنے والوں کے ساتھ بات چیت میں اردو ہی استعمال کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں سماج کے تینوں زمروں یعنی اپر مڈل، مڈل اور لوئر مڈل طبقات میں الگ الگ رائے تھی۔ یہ لوگ کسی ایک بات پر متفق نہ تھے۔ اپر مڈل کلاس اس بارے میں باقی زمروں سے کم ہی متفق تھے۔

سوال: کیا لوگوں کو اردو بولنے والوں کے ساتھ دفتر میں اردو ہی بولنی چاہیے؟

جواب:

	ہاں	نہیں	غیر جانب دار
اپر مڈل کلاس	۴۰ فی صد	۴۶ فی صد	۴۰ فی صد
مڈل کلاس	۶۸ فی صد	۲۷ فی صد	۵۰ فی صد
لوئر مڈل کلاس	۵۹ فی صد	۴۷ فی صد	۶۰ فی صد

اردو کے استعمال اور اردو کے تئیں زبان کی پالیسیوں کے سلسلے میں رجحانات سے متعلق کیے گئے سوالات کے نتائج مختلف گوشوں میں الگ الگ تھے۔ جواب دینے والوں میں تھوڑی سی تعداد ایسی تھی جو صورت حال سے مطمئن تھی لیکن ایسی کافی تعداد تھی اور ان کا تناسب بھی جدا جدا تھا، جو یہ محسوس کر رہی تھی کہ اردو کے لیے نہ کے برابر کام ہو رہا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ کیا اردو زبان کی بقا سرکار کی مدد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ اس کا

جواب اردو بولنے والوں نے اثبات میں دیا۔ مذکورہ تینوں سماجی زمرے کے لوگوں نے اردو زبان کی بقا اور سرکاری امداد کے بغیر اس کے قائم رہنے کے بارے میں بالعموم امید افزا باتیں کہیں۔ متوسط طبقے میں اس کے تئیں امید کا بڑھا ہونا غالباً اردو سے اس کی جذباتی وابستگی کا سبب تھا۔

عام طور پر اردو کے تئیں اردو کے طبقات کی طرف سے کافی مثبت رجحانات دیکھنے کو ملے۔ مزید براں ان نتائج سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ تناسب کے اعتبار سے زیادہ تر جواب دینے والے اردو کے لیے دی جانے والی ادارہ جاتی امداد سے اکثر گوشوں میں غیر مطمئن ہیں۔ زیادہ تر لوگ اردو کے لیے زیادہ مدد کے حامی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اردو ان تمام شعبوں میں دوبارہ دخیل ہو جائے جہاں سے کہ اسے اکھاڑ پھینکا گیا ہے۔

رویّوں کے مطالعوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے سلسلے میں جوابات دینے والی عورتیں تناسب کے اعتبار سے اردو سے وابستگی کے ضمن میں زیادہ ہیں۔ یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی کیونکہ جنس (سیکس) اور اردو کے مشن سے وابستگی کے درمیان میں کوئی اہم ربط قائم نہیں کیا جاتا ہے۔ جواب دینے والوں کی عمر کے اعتبار سے بھی اردو کے تئیں وابستگی کے ساتھ اور اس سلسلے کے جوابات میں کافی فرق دیکھنے کو ملا۔ ان نتائج سے یہ بات سامنے آئی کہ عمر رسیدہ شہری روایات اور ثقافتی ورثے کی بقا اور قیام کے سلسلے میں زیادہ مُتَشَوِّش اور متفکر ہیں۔

اردو میں زبان کے استعمال اور زبان کے تئیں رجحانات کے درمیان رابطوں کے موضوع پر اس مطالعے سے حاصل کردہ نتائج سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طبقے کی اردو کے ساتھ جس درجے میں وابستگی ہے، اسی کے حساب سے وہ زبان کے استعمال پر زور دیتا ہے اور اس طرح سماج کی سوچ میں درجہ بندی ہے۔ گھر میں اردو کے استعمال کو ہی لے لیجیے۔ اس سلسلے میں اردو سے زیادہ عقیدت اور وابستگی دکھانے والوں سے کیے گئے زبان کے استعمال کے سلسلے کے سوالات کے جواب میں ان سب کا کہنا تھا کہ گھر میں اردو ہی بولی جانی چاہیے۔ ایسے عقیدت مندوں نے اردو کے تئیں کم وابستگی دکھانے والوں کے مقابلے گھر میں اردو کے استعمال کے لیے کہا، البتہ سماج میں

وسیع تر پیمانے پر اردو کے استعمال کی زیادہ گنجائش بتائی گئی۔

مذکورہ تینوں طبقوں سے ہر ایک کے تجزیے سے اردو بولی جانے والے خطے میں اردو بولنے کے سماجی ولسانی روّیوں کی نوعیت کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔اس مطالعے سے یہ بات کھُل کر سامنے آتی ہے کہ اردو کی بقاء اور اردو ثقافت کو زندہ رکھنے کی خواہش کا اظہار سب نے کھل کر کیا۔اردو بولنے والوں کے لیے اردو شناخت کی اہم علامت کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی ہے۔

اس مطالعے کے دوران ایک دلچسپ بات دیکھنے کو ملی اور وہ یہ کہ دیہات میں اردو بولنے والوں کو اردو کے تئیں زیادہ وابستگی اور عقیدت ہے اور شہر میں اردو بولنے والوں کے مقابلے دیہات کی اردو آبادی اردو کے تئیں خود کو زیادہ وابستہ کیے ہوئے ہے۔اس سے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ اردو صرف شہر ہی کے اعلا طبقہ کی زبان ہے۔اردو کے لیے دیہات کے اردو بولنے والوں کی تشویش اور عقیدت کچھ اپنے لسانی مضمرات رکھتی ہو گی لیکن زبان کی صحت کے نقطۂ نظر سے یہ ایک اچھی علامت ہے۔دیہی علاقوں میں مدرسوں کی تعداد میں اضافے سے دیہی عوام میں مذہبی اور لسانی بیداری دیکھنے کو ملی۔

اس حوصلہ افزا صورتِ حال میں زبان کو بچانے کی کوئی سنجیدہ کوشش ایسی نہیں کہی جا سکتی جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اب اس کا وقت نکل چکا ہے۔

حوالہ جات

فش مین ۔ جے۔اے (ای ڈی) : ایڈوانسز ان دی سوشیالوجی آف لینگویج : بیسک کنسیپٹس، تھیوریز اینڈ پرابلمز (زبان کی عمرانیات کی پیش رفت: بنیادی نظریات، تھیوریاں اور مسائل) حق : ماؤٹون ۔ ۱۹۷۱ء)

گال۔ایس ۔ لینگویج شفٹ (لسانی تبدیلی) این یارک، اکیڈیمک پریس، ۱۹۷۹ء

پنڈت۔پی۔پی۔ لینگویج ان پلورل سوسائٹی (مشترکہ سماج کی زبان) دی ڈیلی سی ایم کیٹی، ۱۹۷۷ء

سری واستو آر۔این : لنگوسٹک مائنا ریٹیز اینڈ نیشنل لینگویج پیپر (لسانی اقلیتیں اور زبان سے متعلق قومی مقالہ) پیش کردہ سمپوزیم، منعقدہ ٹوکیو، ۱۹۸۲ء

گر بچن چندن

تحریکِ آزادی میں اردو صحافت کا حصّہ

برطانیہ ہندوستان میں تجارت کے لیے آیا تھا لیکن اس کی تجارت کی خواہش جلد ہی ملک گیری کی ہوس میں بدل گئی۔ اس وقت مغل اقتدار زوال کے زینے اتر رہا تھا اور ملک کا مرکزی نظام دم توڑ رہا تھا۔ لیکن شاطر برطانیہ نے تجارتی حکمت اور بردباری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی ہوس کو ایک ہی جست میں مکمل نہ کیا بلکہ سازش بہ سازش اور حیلہ بہ حیلہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو شکست دینے کے سو سال بعد ۱۸۵۶ء میں اس نے اودھ کی سلطنت کو ختم کیا اور اب پورے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔

تقریباً ہر علاقے میں اس کی پیش قدمی کے خلاف محدود پیمانے پر کوئی نہ کوئی مزاحمت ہوئی لیکن جب اس کی دور رس شاطری کلیتاً کام یاب ہو گئی تو اس کی اپنی ہندوستانی افواج اور ہندوستان کے عوام نے ۱۸۵۷ء میں اس کے خلاف ایک اجتماعی بغاوت کی۔

اس بغاوت کے جذبات کو فروغ دینے میں ہندوستان کے اخباروں اور بالخصوص فارسی اور اردو اخباروں نے بہت کام کیا۔

اردو صحافت کے بانیوں میں ملک کے ہر فرقے کے لوگ شامل تھے اور ان کو اپنی وراثت میں خود اردو زبان کے شعرا اور دانش وروں سے فرنگی کی عیّاری کی آگہی اور غلامی سے نفرت کی روایت ملی تھی۔

پلاسی کی جنگ میں سراج الدّولہ کی شہادت پر راجہ رام نرائن موزوں نے جو یہ شعر کہا تھا اس سے اٹھارہویں صدی کے سیاسی جذبات کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

اس کے بعد انیسویں صدی میں، ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بہت پہلے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کے پس منظر میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے، جن کا انتقال ۱۸۲۵ء کے آس پاس ہوا تھا، کہا تھا:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اور پھر اس کافر کی عیاری کے خلاف انقلاب کی خواہش کا اظہار، بلکہ لفظ انقلاب کا شاعری کی سطح پر استعمال، سب سے پہلے اردو زبان ہی میں ملتا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن نے، جن کا انتقال عظیم بغاوت سے پانچ سال قبل ۱۸۵۲ء میں ہوا کہا تھا:

اے حشر جلد کر تہہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

اسی انقلاب کی امید میں اردو صحافت کا مزاج، ابتدا ہی سے باغیانہ رہا۔

اس صحافت کا آغاز ایک ایسی غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ہوا جو صحافت کو اپنے اقتدار کا دشمن سمجھتی تھی۔ عین ۱۸۲۲ء ہی میں، جب اردو اور چند دیگر دیسی زبانوں کے اخباروں کا آغاز ہوا، مدراس پریذیڈنسی کے گورنر تھامس منرو نے کہا تھا:

ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی اور نہ کبھی دی جائے گی۔[1]

دیسی صحافت ابھی یہاں پیدا بھی نہ ہوئی تھی کہ اس حکومت نے مس کے خاندان کے بڑے ارکان یعنی نوزائیدہ انگریزی اخباروں کا، جو اس کے ہم قوم انگریزوں ہی نے شروع کیے تھے، قلم موڑنے کے لیے ان پر طرح طرح کی پابندیاں لگائیں اور جب کوئی قلم نہ مڑا تو اسے توڑنے کے لیے اخبار کے ایڈیٹر کو ہندوستان بدر کر دیا یا مقدموں میں الجھا دیا۔

پھر جب ۱۸۲۲ء میں اردو اور فارسی زبانوں کی چھاپے کی صحافت پیدا ہوئی تو اس کے ایک ہی سال بعد یعنی ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل جان ایڈم نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت لائسنس حاصل کیے بغیر اخبار جاری کرنے کی آزادی یکسر ختم کر دی گئی۔

ہندوستان کے مدیروں نے اس کا استقبال نہ کیا۔

ہمارے اوّلین صحافی راجہ رام موہن رائے نے اس پریس آرڈیننس کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے دیگر اخباروں کے علاوہ اپریل ۱۸۲۲ء میں مرأۃ الاخبار کے نام سے فارسی میں بھی ایک اخبار جاری کیا تھا۔ اسی کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے اس آرڈیننس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی اور جب یہ ردّ ہوگئی تو انھوں نے ہمت نہیں چھوڑی بلکہ مجاہدانہ اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اخبار کی اشاعت بطورِ احتجاج بند کردی۔

یہ احتجاج ایک طرح سے غیر ملکی نظام کے خلاف احتجاج تھا اور یہیں سے ہندوستانی صحافیوں کی تحریکِ حرّیت کا آغاز ہوگیا۔

اردو صحافت میں اس تحریک کا ابتدائی اظہار قدرتی طور پر فارسی اخباروں میں ہوا۔ کیونکہ وہ اس کے خاندان کے اوّلین ارکان تھے۔

مرأۃ الاخبار کے احتجاج کے بعد کلکتہ کے کئی اور فارسی اخباروں نے بھی فرنگی راج کی ناگواری کو فاش کیا۔ ان میں 'سلطان الاخبار'، 'گلشنِ نوبہار' اور 'دوربین' شامل تھے ان سب پر باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں مقدمے دائر ہوئے۔[۲]

اردو کا اوّلین اخبار 'جامِ جہاں نما' 'مرأۃ الاخبار' سے تقریباً ایک ماہ قبل شروع ہوا۔ اس کا بانی ہری ہردت ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک تھا لیکن اس نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود برطانوی راج کی لغزشوں، شوخیوں اور کوتاہیوں پر نکتہ چینی کی۔

ان دنوں عدالتوں اور اشراف کی زبان فارسی تھی۔ بازار میں اردو کی کوئی عوامی مانگ نہیں تھی۔ ان حالات کے تحت 'جامِ جہاں نما' ابتدائی قریب دو ماہ کے بعد فارسی میں چھپنے لگا۔ لیکن اس کے بانی ہری ہردت نے عوامی زبان اردو میں اخبار جاری رکھنے کا خیال نہ چھوڑا اور ایک سال بعد فارسی ایڈیشن کے ساتھ چار صفحات کا ایک آزاد اردو ضمیمہ بھی شامل کیا۔ جو قریب پانچ سال تک چھپتا رہا۔ حکومت اس کی آزاد روی سے ناخوش تھی، لہٰذا اس کی رعایتی ڈاک کی امداد بند کردی۔ اخبار نے امداد کی بحالی کے لیے کوئی درخواست نہ دی بلکہ اپنی پیشانی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہر ہٹادی جو روزِ اوّل سے شائع ہو رہی تھی۔

مشرقی ہند میں آغاز کے پندرہ سال بعد مطبوعہ اردو صحافت ۱۸۳۷ء میں شمالی ہند

میں آئی۔ یہاں دہلی سے جاری ہونے والے اردو کے اوّلین اخبار" دہلی اردو اخبار" کا ایڈیٹر مولوی محمد باقر فطرتاً مجاہدِ آزادی تھا۔ وہ پولیس کی نااہلیوں اور فرنگی کی زیادتیوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس کی رپورٹنگ بہت دلچسپ اور جامع ہوتی تھی جس سے نہ صرف اس کے قارئین اس کے گرویدہ ہوتے گئے، بلکہ اس رپورٹنگ پر ان کی آپسی گفتگو سے سیاسی شعور کو فروغ ملتا تھا۔ یہ اخبار اپنے دور کے بے باک اخباروں میں پیش پیش تھا۔ اس کی بے باکی کی پشت پر ان جہاندیدہ وقائع نگاروں کی روایت تھی جو مغل سلطنت کے زوال کے بعد سرکاری سرپرستی اور ملازمت سے محروم ہو گئے تھے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان میں سے بہت سوں نے اپنے قلمی اخبار نکال لیے تھے۔ یہ اخبار فرنگی نظام کی من مانیوں، ناگواریوں اور عیاریوں پر کھلم کھلا لکھتے تھے۔ ان کے بارے میں اس دور کے برطانوی حکام اور مؤرخوں نے بڑے اضطراب کا اظہار کیا۔

یہ اخبار متحدہ قومیت کی سوچ اور مقصد کی وحدت کے حامل تھے اور یہی ذہنی رو پُراسرار طور پر 'دہلی اردو اخبار' اور اس کے ہم عصروں میں بھی چلتی رہی۔ ان میں 'صادق الاخبار' بہت نمایاں تھا۔ ان اخباروں کی تحریروں سے حالات کی وہ صورت پیدا ہوئی جس نے ۱۸۵۷ء میں ایک عظیم بغاوت کی شکل اختیار کی۔

'دہلی اردو اخبار' نے آنے والے اس طوفان کی دستک بہت پہلے سن لی تھی۔ چنانچہ بغاوت مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی لیکن 'دہلی اردو اخبار' کے مارچ ۱۸۵۷ء کے ایک شمارے میں گائے اور سوّر کی چربی والے بدنام کارتوسوں کے بارے میں یہ خبر شائع ہوئی:

سرکشیِ افواجِ انبالہ

صاحبِ فرینڈ آف انڈیا تحریر کرتے ہیں کہ ان دنوں تمام سپاہ سرکاری نے نئے نئے کارتوسوں سے سرتابی کرنی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال میں کچھ پلٹن بھر گئی تھی۔ ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ آج از روئے تار برقی معلوم ہوا کہ پلٹن گورکھا نمبر ۱۶ مقیم انبالہ نے بروقت قواعد عمل در آمد کارتوس سے انکار کیا۔ بہ مجرد اطلاع افسر سپاہِ ہندوستانی ایک ہندوستانی ترپ کو حکم زیر کرنے سرکش پلٹن کا دیا اور ان پر فائر کرانے شروع کیے۔ کہتے ہیں کہ اس طوفان

بے تمیزی میں ایک بارک گوروں کی پچھلی رات کو جل کر راکھ ہو گئی اور
ایک ہندوستانی پیادوں کا اسپتال جو کہ فاصلہ میل بھر کا رکھتا تھا، پھک گیا۔*
ایسی ہی خبریں اردو کے دوسرے اخباروں میں بھی چھپیں۔

بدنام کارتوسوں سے برہمی کے علاوہ اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے جو سلوک کیا تھا اردو اخبار اس سے بھی بہت ناراض تھے۔ اودھ کی سلطنت ختم ہوئے دس ماہ ہو چکے تھے اور وہاں کمپنی بہادر کی باضابطہ حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس مرحلے پر لکھنؤ کے جریدے 'طلسم لکھنؤ' نے اپنے جنوری ۱۸۵۷ء کے شمارے میں اپنی پہلی ہی خبر میں کہا:

لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے۔ چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے۔ جو سانحہ ہے عجائب ہے۔
آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے۔
ع میر صاحب زمانہ نازک ہے دونوں ہاتھوں سے تھام لو دستار*
جس دن سے (واجد علی شاہ کی) سلطنت نہ رہی، شہر بگڑا، چوروں کی بن آئی۔ کسی میں حالت نہ رہی ... اس اندھیر پر ایک مثل یاد آتی ہے کہ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا ہے۔ اس شہر میں اندھا دھندی ہے ... اور نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے۔ صاف اندھے کے ہاتھ میں بٹیر ہے۔ روزانہ باتیں عجائب ہوتی ہیں۔ سوجھتا تو خاک نہیں۔ ٹٹو ٹٹول کر چٹھیاں غائب ہو جاتی ہیں۔

اس اقتباس کے آخری ٹکڑے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خطوں کو سنسر کرنے کا طریقہ شدّت سے برتا جا رہا تھا جس کی نوعیت بھی سیاسی ہی رہی ہوگی۔
اب 'سلطان الاخبار' کی یہ خبر دیکھیے جو جنوری ۱۸۵۷ء ہی کے ایک شمارے میں چھپی۔ یہ راجستھان کے رجواڑوں سے متعلق ہے:

" اخبار انگلش میں مطبوعہ ۱۲ دسمبر ۱۸۵۶ء سے معلوم ہوا کہ اطاعت کا قرینہ زمانے سے معدوم ہوا۔ ان دنوں جتنے راجہ ہیں سب نے بالاتفاق چھٹی اس مضمون کی تحریر کی ہے۔ جرأت کی تقریر کی ہے کہ جو سرکار کمپنی خلاف عہود و مواثیق رؤسائے ہندوستان کی ریاست بہ جبر لیتی ہے اس سے ایک تو

خلقت بیکاری سے مرتی ہے۔ دوسرے بسی بسائی بستیاں سرکار ویران کیے دیتی ہے۔

اس باعث سے ہم لوگوں نے باہم ہر ایک کو فساد پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا ملک اگر لیں گے تو جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلاف عہد و پیماں اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سر میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے۔
جس دم معرکۂ کارزار کی گرم بازاری ہوگی دیکھ لینا کیسی ذلّت و خواری ہوگی۔" [۴۵]

اسی طرح گلشن نوبہار (کلکتہ) 'حبیب الاخبار' (بدایوں)' عمدۃ الاخبار (بریلی) اور سراج الاخبار (دہلی) نے بھی ہندوستانیوں کے خلاف فرنگی حکومت کی پریشان کن حرکتوں کو بے نقاب کیا۔ بغاوت دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے شروع ہوئی، اور گیارہ مئی کو باغی فوج دہلی میں داخل ہوئی اور اس نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کا بادشاہ بہادر شاہ ہے۔

عین شروع ہی میں اسے معجزہ نما کامیابی نصیب ہوئی کئی مقامات پر مجاہدینِ آزادی کا اقتدار قائم ہو گیا۔ دہلی کے اخباروں نے جن میں 'دہلی اردو اخبار' 'صادق الاخبار' اور 'سراج الاخبار' پیش پیش تھے' اسے ایک جنگِ آزادی ہی تصور کیا اور اس کی ولولہ انگیز خبریں شائع کیں۔ جذبات کو تیز کرنے والی نظمیں' پر جوش ولولہ انگیز مضامین اور مشورے روزانہ شائع ہونے لگے۔ روحانی بزرگوں کے خواب بھی جن میں انگریزوں کی حکومت کے خاتمہ کی بشارت دی گئی' نمایاں طور پر شائع کیے گئے۔ 'صادق الاخبار' نے اپنے ۱۳ راگست ۱۸۵۷ء کے اداریے میں لکھا:

"گورے ہزاروں طرف سے کھنچ کر آئے' فرنگیوں نے لاکھ تدبیر تسخیر دہلی کی کی۔ مگر نہ گوروں کی شجاعت کام آئی اور نہ تقدیر کے آگے کچھ تدبیر پیش گئی۔ جہاں تہاں کفار گاجر کی طرح کاٹے اور مولی کی مانند چھانٹے گئے۔ باقی قدرے قلیل میدان علی پور میں ہیں۔ ان کی بھی عنقریب سن لیں گے کہ وہ بھی تہرائی سے خس کم جہاں پاک ہوئے اور شاہ گیتی پناہ کا تسلط تمام ہندوستان میں ہو گیا۔" [۴۶]

'دہلی اردو اخبار' نے بغاوت کے بہادروں اور ترک سواروں کی کامیابی کے عینی مشاہدے شائع کیے۔ ساتھ ہی ساتھ متوفّی اور مغرور فرنگی حکّام کی اسامیوں پر بہادر شاہ ظفر کے احکام سے ہندوستانیوں کے تقرّر کا اعلان کیا گیا۔

اسی زمانے میں مولانا بدرالاسلام عباسی بدایونی کا یہ مصرعہ زبانِ زدِ خاص و عام ہوا

سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤ آنے میں

مولانا امداد صابری کی تحقیقی کتاب "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا" کے مطابق مولانا بدرالاسلام عباسی ان ۴۵ شعرا میں شامل تھے جن کو باغیانہ کلام شائع کرنے کے جرم میں انگریز نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

'دہلی اردو اخبار' کے مہتمم مولوی محمد باقر کے بیٹے مولانا محمد حسین آزاد نے اس بغاوت کی ابتدا میں جب غازیانِ بغاوت نے دہلی سے انگریزوں کا قلع قمع کر دیا — تو ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں "تاریخِ انقلاب عبرت افزا" کے عنوان سے ایک نظم شائع کی جس میں فرنگی حکمران کی ہجو اور مذمت کی گئی اور اس بغاوت کی تاریخ نکالی گئی۔
اس نظم کے چند اشعار حسب ذیل تھے:

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ — تھی صاحبِ اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھی صاحبِ علم و ہنر و حکمت و فطرت — تھی صاحبِ جاہ و حشم و لشکرِ جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے — آفاق میں تیغِ غضبِ حضرتِ قہار
سب جوہرِ عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے — سب ناخنِ تدبیر و خرد ہو گئے بے کار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا — ہے گردشِ گردوں بھی عجب گردشِ دوار

اس واقعہ کی پائی یہ آزاد نے تاریخ
دل نے کہا قل فاعتبروا یا اولی الابصار[۲]

دہلی کی جامع مسجد سے ۳۵ باثر علما نے عیسائیوں کی حکومت کے خلاف فتویٰ جہاد جاری کیا جسے اردو اخباروں نے وسیع اشاعت دی۔ یہ باغیوں کے ایک سالار جنرل بخت خاں کے ایما پر جاری ہوا تھا۔ اور 'صادق الاخبار' (دہلی) کے ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں چھپا[۳]۔

اس اخبار نے بغاوت کے پہلے مرحلے کی معرکہ خیز کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے تین اگست ۱۸۵۷ء کے شمارے میں لکھا:

"یہ تو خداوند تعالیٰ کی ہندوستانیوں پر عنایت ہے کہ انگریزوں کو انھیں کی فوج نے غارت کر دیا نہیں تو دیکھتے کہ ان کی بدنیتی اہلِ ہند کو کیا کیا مزے کھاتی

"..... انگریزوں کو یہاں کس نے بلایا تھا اور کس خاندان سے اختیارِ حکومت ملا۔
گو اس عرصہ میں وہ قوی ہو گئے اور کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے۔ مگر خداوندِ تعالیٰ
تو قادر و توانا اور منصف ہے۔"[۵]

لیکن فرنگی کی برتر طاقت، باغیوں میں جنگی مہارت کی کمی اور کئی ہندوستانی طبقوں کی بے وفائی سے بغاوت ناکام ہو گئی۔ جب انگریز دہلی پر پھر قابض ہو گیا تو "دہلی اردو اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی قربان گاہ پر مطبوعہ دیسی صحافت کی اوّلین شہادت تھی۔ "صادق الاخبار" کے ایڈیٹر جمیل الدین ہجر کو بغاوت کے ایک مقدمے میں ماخوذ کیا گیا اور اسے تین سال قید کی سزا ہوئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے لیکن وہ دہلی سے روپوش ہو گئے۔ صوبہ سرحد کے اخبار "مرتضائی" کے مدیر کو باغیانہ مضامین لکھنے پر پشاور میں قید کر دیا گیا۔ پورے پریس کا گلا گھونٹ دینے کے اقدام کیے گئے۔

جے۔ نٹراجن کی ہسٹری آف انڈین جرنلزم میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۳ء کی سرکاری فہرست میں اردو کے اخبارات کی تعداد ۳۵ تھی۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست میں یہ بارہ رہ گئی۔ ان میں پرانے اخباروں میں سے صرف ۶ باقی تھے۔ باقی چھ نئے تھے۔[۶]

بغاوت سے قبل بڑی ہیبت و جبروت کے ساتھ کمپنی کی حکومت قائم تھی۔ اس کے عہد میں آزادی کا مطالبہ تو ایک طرف آزادی کے لفظ کا استعمال بھی کا رے دارد تھا۔ اس کے باوجود اخباروں نے "جو اپنے وسائل کے لحاظ سے نہایت حقیر تھے"، سیاسی شعور اور ولولہ بیدار کرنے میں بڑی ہمت اور دلیری سے کام لیا۔ یہ اخبار بڑے سیدھے سادھے اور معصوم سے پرچے ہوتے تھے۔ ان کی خبریں بھی بہ ظاہر غیر سیاسی قسم کی ہوتی تھیں لیکن ان کے اندازِ بیان اور مواد کی گہرائی میں غم و غصے کا ایک دبا ہوا طوفان ہوتا تھا جو قارئین کے دل و دماغ میں سرایت کر جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے زمانے کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا:

"اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گذشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی،

چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔[48]

۱۸۵۷ء تک اردو اور دیگر زبانوں کے اخباروں کی خبروں کا سب سے بڑا ذریعہ قلمی اخبارات تھے جو دیسی حکمرانوں اور امراء کی ہدایت اور ان ہی کی ضرورت کے لیے جاری ہوتے تھے۔ ان کا موقف اور مرتبہ محدود تھا لیکن ان کی تعداد خاصی کثیر تھی۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ایک رکن مسٹر میکالے نے ۱۸۳۶ء میں اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ صرف دہلی سے ہر ہفتے ۲۰ قلمی اخبار بذریعہ ڈاک باہر بھیجے جاتے ہیں۔[49] ان کے مواد کی تہ میں وطن کی حرمت اور حریت کا ایک گہرا جذبہ موجزن ہوتا تھا۔ ان کا رواج جنوبی ہند میں بھی موجود تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۶ء میں ویلور کے غدر کی وجوہ بیان کرتے ہوئے سر جان میلکم نے کہا تھا کہ اس غدر میں قلمی اخبارات کا بڑا دخل تھا۔ پھر ۱۸۳۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے کہا کہ ہر جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو قلمی اخبارات اشتعال انگیزی پر اتر آتے ہیں۔[50]

۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت بھی ختم ہو گئی اور اس کے اختیارات تاجِ برطانیہ کو منتقل ہو گئے۔ برطانیہ کے کچھ داناؤں نے جن میں جان کلارک مارش مین نمایاں تھے بغاوت پیدا کرنے کی ساری ذمہ داری کمپنی پر عائد کی اور پارلیمنٹ کے نئے نظام کو ہندوستان کی اصلاح و بہتری کی تدبیر قرار دیا۔ لیکن ہندوستانی صحافت کے متعدد طبقوں نے حکمراں کے لباس کی تبدیلی سے اپنے تصورات نہ بدلے۔

اس نئے دور کا آغاز بھی صحافت پر نئی سختیوں اور پابندیوں سے ہوا تھا جس کی وجہ سے کافی اخبار محتاط اور اعتدال پسند ہو گئے تھے لیکن یہ ایک وقتی مصلحت تھی۔ اردو صحافت میں فرنگی راج کی ناانصافیوں اور ناگواریوں کے خلاف یہاں وہاں احتجاج ہوتا رہا۔ ۱۸۶۰ء میں اجمیر کے ایک ہفت روزہ خیر خواہ خلق (ایڈیٹر اجودھیا پرشاد) نے ہندوستانیوں کو اسلحہ سے محروم کرنے کے سرکاری فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ اہلِ ملک کو شخصی دفاع کے لیے ہتھیار رکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ انگریز حکومت اس مشورے کو برداشت نہ کر سکی اور اخبار کو حکماً بند کر دیا۔ اس وقت یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس کی اشاعت حکومت نے قانون کے اطلاق سے بند کرائی۔

۱۸۵۹ء میں مکند لال نے آگرہ سے ماہ نامہ تاریخِ بغاوتِ ہند جاری کیا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے واقعات کے لیے وقف تھا۔ اس میں سلسلہ وار ہندوستان کے مختلف ضلعوں اور شہروں کے جنگِ آزادی کے واقعات درج کیے جاتے تھے اور کسی دوسرے عنوان کا مضمون شائع نہیں ہوتا تھا۔ اس میں کانپور کے جسے نانا صاحب نے آزاد کرا کے وہاں اپنی آزاد حکومت قائم کر دی تھی، واقعات تفصیل سے چھپتے رہے۔

'تاریخِ بغاوتِ ہند' کے بعد ۱۸۶۶ء میں ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے جاری ہوا جس نے علی گڑھ کو ہندوستان کے نہ صرف صحافتی بلکہ سیاسی نقشے کا روشن ستارہ بنا دیا اس کے بانی سماجی اصلاح کے داعی اور فروغِ تعلیم کے مشنری سر سید احمد خاں تھے۔ انھوں نے یہ اخبار اپنی نئی علمی مجلس "سین ٹیفک سوسائٹی" کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لیے جاری کیا۔ لیکن اس کی نوعیت نمایاں طور پر سیاسی تھی۔

اس اخبار نے اپنے ابتدائی دور میں پریس کی آزادی کو اپنا نصب العین بنایا اور اپنے سرورق پر اسی موٹو کا اعلان کیا۔ یہ اخبار اردو اور انگریزی دو زبانوں میں چھپتا تھا۔ بقول مولانا حالی "اس اخبار کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی ... اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے ...

اس کے لیڈنگ آرٹیکل سر سید احمد خود لکھتے تھے۔ پھر ملکی اور غیر ملکی انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے' برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔"[۱۱]

ان میں دادا بھائی نوروجی۔ ڈبلیو سی بنرجی اور سید بدر الدین طیب جی کے مضامین شامل تھے جو اس دور کی سیاسی ترقی پسندی کے نمائندہ اکابر تھے۔ اس اخبار نے قومی وحدت کو مضبوط کرنے، وطنی رفاقت کو بڑھانے اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اسی زمانے میں لاہور سے 'اخبارِ عام' اور 'رہبرِ ہند'، الہ آباد سے 'قیصرالاخبار'، دہلی سے 'اکمل الاخبار' اور آگرہ سے 'حیاتِ جاودانی' اور 'آگرہ اخبار' جاری ہوئے جو مجاہد اخباروں کی صف میں تو شامل نہیں تھے لیکن تحریکِ آزادی کے ہم سفر رہے۔ انھوں نے فرنگی حکام کی رعونت۔ بے انصافی اور نسلی امتیازات کے موضوعات پر تیز اور کاری مواد شائع کیا۔

لیکن ان موضوعات کی تیز تر عکاسی کرنے والا اخبار ہفت روزہ 'اودھ پنچ' تھا جسے منشی سید محمد سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری کیا۔ اس اخبار نے غیر ملکی حکومت کے سامراجی مزاج اور منصوبوں کو بے نقاب کرنے کے لیے طنز و مزاح کا حربہ استعمال کیا۔ احتیاط اور اعتدال پسندی کے اس دور میں بہت سارے اخباروں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے طنز و مزاح کا طریقہ اختیار کیا تھا لیکن 'اودھ پنچ' کا انداز سب سے الگ اور منفرد تھا۔ اس نے طنز و مزاح کے ذریعے قومی سیاسی موقف کو واضح شکل دی۔ اس نے الحاقِ اودھ۔ دیسی پریس کو دبانے والے قانون اور البرٹ بل کی مخالفت کی۔

یہ پہلا اردو اخبار تھا جس نے کارٹون کو رائے زنی کا ذریعہ بنایا اور مخالف کو نیچا دکھانے کی نئی راہ نکالی۔

اس دور میں قوم پرستی کی ایک نئی لہر چل رہی تھی جس کا سرچشمہ بنگال کے دانشوروں کا ایک گروہ تھا۔ انھیں میں ایک صحافی سریندر ناتھ بینرجی تھا۔ وہ اس وقت کے کلکتہ کے ممتاز انگریزی روزنامہ دی بنگالی کا ایڈیٹر تھا۔ اور ۱۸۷۶ء میں کلکتہ میں قائم ہونے والی ایک سیاسی جماعت انڈین الیسوسی ایشن کے بانیوں میں تھا۔ اس جماعت کی تنظیم و توسیع کے لیے اس نے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۸۷۸ء میں حکومت نے ورنیکلر پریس ایکٹ کے نام سے جب لسانی اخباروں کے خلاف ایک امتیازی قانون نافذ کیا تو سریندر ناتھ بینرجی نے اس کے خلاف ایک مہماتی انداز سے رائے عامہ تیار کی اور اس مہم سے اردو کے اکثر اخباروں نے تعاون کیا۔

۱۸۸۱ء میں ورنیکلر پریس ایکٹ منسوخ کر دیا گیا۔

۱۸۸۱ء ہی میں وائسرائے لارڈ رپن نے اخبارات کے اجرا پر بے جا پابندیوں کو

دور کر دیا۔ پھر ۱۸۸۲ء میں جب البرٹ بل آیا تو سریندر ناتھ بنیرجی اس کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھے۔ اس بل کے تحت فوجداری مقدموں میں ہندوستان کے یورپین باشندوں کے معاملوں کا فیصلہ ہندوستانی جج اکیلے نہیں کر سکتے تھے بلکہ متعلقہ جیوری کے لیے یہ لازم کیا گیا کہ اس میں نصف تعداد یورپین ججوں کی ہو۔

یہ بل قانون نہ بن سکا۔ اس کے برعکس اس نے فرنگی راج سے بیزاری میں مزید اضافہ کر دیا۔ ۱۸۸۳ء میں کلکتہ ہائی کورٹ نے سریندر ناتھ بنیرجی کو توہینِ عدالت کے ایک مقدمے میں ماخوذ کر لیا کیوں کہ انھوں نے اس عدالت کے ایک ایسے فیصلے پر نکتہ چینی کی تھی جس میں ایک عبادت گاہ کے معاملوں میں مداخلت کا پہلو نمایاں تھا۔ عدالت نے انھیں جرمانہ کی بجائے دو ماہ کی جیل قید کی سزا دی جس کے خلاف پورے ہندوستان میں غم و غصّے کے جذبات پیدا ہوئے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں بھی ان کی گرفتاری کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس کی صدارت سر سید احمد خاں نے کی۔ سر سید سریندر ناتھ بنیرجی اور ان کے مشن کے بڑے قدر دان اور مدّاح تھے۔ شمالی ہند کے دوروں میں سریندر ناتھ دو بار علی گڑھ گئے اور دونوں بار سر سید کے ادارے نے ان کے لیے استقبالیہ جلسے کیے۔

سریندر ناتھ کی رہائی کے بعد ان کی انڈین ایسوسی ایشن نے ۱۸۸۳ء میں ایک کل ہند سیاسی کانفرنس کی جس میں ملک کے ۴۵ مقامات سے تقریباً ایک سو نمائندوں نے شرکت کی۔ یہ اپنی نوعیت کی اوّلین کانفرنس تھی۔ بہر حال یہ کانفرنس فرنگی راج کے اس وقت کے سامراجی روّیے اور اقدام کا فوری ردِّ عمل ہی تھی۔ ابھی ایک مستقل سیاسی جماعت کے ذرائع اور وسائل مجتمع نہیں ہوئے تھے۔

یہ اہتمام ۱۸۸۵ء میں ہوا جب اسی راج کے ایک لبرل دانشور سر آلیور آکٹیوین ہیوم نے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور نمائندوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اوّلین اجلاس ہوا۔ سر آلیور آکٹیوین ہیوم انڈین سول سروس کے ایک آفیسر تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے لیے موصوف نے دیگر سماجی اور سیاسی اکابرین کے علاوہ سر سید احمد خاں کو دستِ تعاون بڑھانے کے لیے کہا تھا۔ لیکن انھوں نے اس کا کوئی مثبت جواب نہ دیا۔

کانگریس کے اس اوّلین اجلاس میں دیگر مندوبین کے ساتھ ساتھ چودہ ہندوستانی

اخباروں کے ایڈیٹروں یا نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ ان میں سے تین ایڈیٹر اردو اخباروں سے تھے۔ ان اخباروں کے نام اودھ پنچ (لکھنؤ) ہندوستانی (لکھنؤ) اور نسیم (آگرہ) تھے۔

یہ جماعت اس وقت کوئی انقلابی جماعت نہیں تھی اور نہ ہی یہ ملک کے لیے آزادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس وقت یہ صرف ملازمتوں، نمائندگیوں اور چند شہری آزادیوں کی لفظی طلب گار تھی لیکن یہ اہلِ وطن میں ان کے حقوق کے ایک منور اور منظم احساس کی پرورش کر رہی تھی۔

اس احساس کی تشکیل میں ایک ایسے اقتصادی شعور کی بیداری بہت اہم تھی جس کا تعلق ملک کے ہر باشندے اور ہر فرقے سے یکساں اور براہ راست تھا۔ ملک کے کچھ اکابر اور بالخصوص سر سید احمد خاں کی قیادت میں کام کرنے والے علی گڑھ گروپ نے اس شعور کو مذہب اور فرقے کے تصورات کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا۔ کانگریس کے رہبروں میں اس دور کے ممتاز دانشور تھے جو زمانہ شناس بھی تھے اور اعتدال پسند بھی۔ سیاسی معاملوں میں وہ دلاوری کی جگہ فہم و فراست سے کام لیتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں وہ تاجِ برطانیہ کے قصیدے سناتے رہے۔ یونین جیک کو سلامی دیتے رہے۔ اپنی زبان سے آزادی کا لفظ نہیں نکالا لیکن ایسے حالات کی ضرورت ضرور جتائی جو آزادی کے لوازم تھے۔ انھوں نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل کا ہندوستان انگریز کے بغیر ہی خوشحال اور روشن ہوگا۔ انھوں نے علی گڑھ گروپ کا رویّہ دیکھ لیا تھا اور وہ اس کے حامیوں کے جذبات اور زود حسی کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے غیر ملکی حکومت کی ان اقتصادی پالیسیوں کو بڑی مستعدی سے نمایاں کیا جو ملک کے اصل باشندوں کو مفلس اور محتاج بنا رہی تھیں۔ ان کی گھریلو صنعتوں کو بے اثر کر رہی تھیں اور ان کی آفتوں اور مشکلوں سے غفلت برت رہی تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ انگریزوں کی حکومت سے قبل ۱۸ ویں صدی میں ہندوستان ایشیا کا ہرا بھرا باغ اور مشرق کا اناج گھر تصور کیا جاتا تھا لیکن فرنگی نظام کے بعد ۱۹ ویں صدی میں یہ خشک سالی اور بھکمری کا شکار ہو گیا۔ سونے کی چڑیا سے فاقہ کشی اور لاغری کی پوٹ بن گیا۔ اس نظریے سے ہر فرقے کے لوگوں کو اتفاق تھا۔ لہٰذا دیسی اخباروں میں اس کی وضاحتوں نے وسیع اشاعت پائی۔

۱۸۵۷ء کی عظیم بغاوت کے بعد اردو اخبارات کی تعداد میں رفتہ رفتہ اچھا اضافہ ہوگیا تھا لیکن ان کے سیاسی موقف میں کوئی حتمی پختگی یا مرکزیت موجود نہیں تھی۔ فرنگی راج کے جبرو استبداد کی وجہ سے یہ مرکزیت ابھی سیاست میں بھی قائم نہیں ہوسکی تھی۔

بہرحال اس بغاوت کے ۲۸ سال بعد انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے اس کی مرکزیت کی زمین ہموار ہوگئی۔ اہلِ سیاست کو ایک مشترکہ اور کل ہند پلیٹ فارم مل گیا۔ ان کی فکرو دانش میں نئی سرگرمی پیدا ہوئی۔ حکمران کی زبان میں بات کرنے والے کانگریس کے حامی ہندوستانی ملکیت کے انگریزی کے نئے اخبار جاری ہوئے۔ اس اضافے کی بدولت سیاسی کالموں اور کالم نگاروں میں بھی خوب اضافہ ہوا۔

اب دیسی اخباروں کو سیاسی دانشوروں اور مفکروں کی سرگرمیوں اور تجویزوں سے، جن میں برطانیہ کے روشن خیال لیڈروں کے جمہوری نظریات کے حوالے اکثر دیے جاتے تھے، نئے عنوان اور نئے موضوع مل گئے۔ انھوں نے نہ صرف ان کے متن شائع کیے بلکہ اپنے اداریتی کالموں میں ان پر تبصرے بھی کیے۔ اس عمل میں ان کے سیاسی موقف واضح ہوتے رہے۔

اسی زمانے میں دیسی صحافت کو، جو انگریزی اخباروں کی نسبت قارئین کے زیادہ نزدیک تھی، نئی اہمیت اور نئی وسعت ملی اور یہ رائے عامہ بنانے کا ایک طاقت ور وسیلہ بن گئی۔

دیسی صحافت کی اس ترقی کے انقلابی امکانات سے برطانوی سیاست دان بہت متشوش ہوئے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ ہیملٹن نے جو ۱۸۷۴ء میں ہندوستان میں تھا، بعد میں لارڈ کرزن کے نام اپنے ایک خط (مورخہ ۱۷ جولائی ۱۸۹۶ء۔ ریکارڈ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا) میں کہا کہ وہ دیسی اخبار جو پہلے وائسرائے۔ گورنر یا اعلیٰ برطانوی افسروں کے سیاسی خیالات کا کوئی حوالہ نہیں دیتے تھے۔ اب تقریباً ہر روز برطانوی پالیسیوں کے حوالے دیتے ہیں اور مختلف برطانوی اربابِ اختیار کے کردار کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لارڈ ہیملٹن نے کہا کہ "مجھے اس سے کوفت ہوتی ہے اور میں اس رجحان کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا"

نئے رجحان کو فروغ دینے والی کانگریس کے شرکاء میں سرکار کے خطاب یافتہ اور

وفادار لوگ کثرت سے شامل تھے۔ لیکن پھر بھی کئی طبقوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کے پیچھے اس جماعت کی امکانی سیاسی قوت سے خائف فرنگی کا بھی ہاتھ تھا جسے بعض ہندوستانی زعمائے نے لبیک کہا۔ ان میں اودھ اخبار کے بانی منشی نول کشور۔ مہاراجہ بنارس۔ ان کے سیاسی مشیر خاص راجہ شیو پرشاد اور اودھ کے کئی تعلقہ دار امرا اور مہاجن شامل تھے۔ منشی نول کشور کا خیال تھا کہ کانگریس ایک بغاوت انگیز مجمع ہے[41]۔

سر سید احمد خاں نے بھی جن کا مسلمانوں میں بہت اثر و رسوخ تھا۔ اس نوزائیدہ کُل ہند سیاسی جماعت کی مخالفت کی اور اپنے ہم مذہبوں کو اس جماعت سے دُور رہنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمان جو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اور تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہیں' اکثریت سے سیاسی اشتراک گوارا نہیں کر سکتے۔ انھوں نے برطانوی اقتدار کو ایک مستقل نظام تصوّر کیا اور اپنے ہم مذہبوں سے اس کی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی حکومت غیر جانبدار ہے اور ان کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتی لہٰذا انھیں اس کے نزدیک رہنا چاہیے۔

اس تصوّر نے قومیت کے اُبھرتے ہوئے نظریے کے برعکس ایک نیا رویّہ پیدا کیا جس سے ہندوستان کی سیاست میں ایک دوراہا پیدا ہو گیا۔ اس دوراہے سے فرنگی راج کو وہ طوالت نصیب ہوئی جس کے لیے وہ روزِ اوّل ہی سے مختلف تدبیریں کر رہا تھا۔

اختلاف کے اس نظریے پر اردو اخباروں میں بحث و مباحثے کے کئی دروازے کھل گئے اور یہ بحث ہماری صحافت کا ایک موضوعِ خاص بن گئی۔

اس زمانے میں اردو اخبار زیادہ تر صوبجات متحدہ (اتر پردیش) اور پنجاب سے شائع ہوتے تھے لیکن پنجاب کے اخباروں کا سرکولیشن نسبتاً زیادہ تھا ان میں مسلم ملکیت کے کئی اخباروں نے علی گڑھ کے موقف کی حمایت نہ کی۔

چنانچہ صوبجات متحدہ میں اودھ پنچ۔ 'شحنۂ ہند' اور 'مہر نیم روز' پنجاب میں 'ملا دو پیازہ'۔ 'پتے خاں'۔ 'رہبر ہند' اور 'پیسہ اخبار' اور بنگال میں 'دارالسلطنت'۔ 'گائیڈ' اور 'احمدی' نے علی گڑھ کے موقف کی مخالفت کی۔ ان میں سے ہر ایک اخبار کا سرکولیشن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے سرکولیشن سے زیادہ تھا۔

لیکن علی گڑھ کے نظریے میں کچھ برطانوی حلقوں نے بڑی وافر اور مسلسل دلچسپی لی۔ انھیں ہندو مسلم علاحدگی میں برطانوی راج کی شادابی نظر آتی تھی۔ اس حلقے میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک پیش پیش تھے۔ انھوں نے سرسید کی کانگریس مخالف تقریروں اور تجویزوں کے انگریزی میں ترجمے کیے۔ ان پر اپنی حاشیہ آرائی کی اور ہندوستان اور برطانیہ کے سامراج پسند اخباروں میں ان کی اشاعت کرائی۔ الہ آباد کا یورپین اخبار 'پاؤنیر' نہ صرف اس باب میں سرفہرست تھا بلکہ اس مواد کی ادارتی حمایت بھی کرتا رہا۔

سرسید کے مفید مطلب نظریات کے ترجمے کرنے کے علاوہ تھیوڈور بیک خود بھی 'پاؤنیر' کے کالموں میں انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف لکھتا رہا۔ کانگریس کے قیام کے تین ہی سال بعد اس نے ۱۸۸۸ء میں 'پاؤنیر' میں ایک مضمون کے دوران کہا کہ کانگریس ملک کو بغاوت کا راستہ دکھا رہی ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے انگریز وہی تادیبی اقدام کریں گے جو انھوں نے ۱۸۵۷ء میں کیے تھے۔

مسٹر بیک کے جانشین مسٹر مارلسن (۱۹۰۰ء - ۱۹۰۵ء) نے بھی ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دینے والے مضامین لکھے اور پھر ان کے جانشین مسٹر آرچ بالڈ نے مسلم لیگ کی تشکیل کے لیے عملی کام کیا۔ انھیں کی سفارش پر وائسرائے نے شملہ میں مسلمانوں کے اس وفد سے ملاقات کی جس کی قیادت ۲۹ سال کے نوجوان ہز ہائی نیس آغا خان کر رہے تھے اور جس نے بعد میں مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی۔[۵۴]

بہرحال کانگریس کے اجلاسوں میں جہاں غیر ملکی حکومت کی اقتصادی پالیسیوں کے امور بڑی واقفیت اور متانت سے نمایاں کیے جاتے تھے، ہر فرقے کے نمائندوں کی شرکت میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا اور سال بہ سال اس کے اجلاسوں کے لیے اردو صحافت کی حمایت بھی بڑھتی رہی۔

۱۸۸۸ء میں میرٹھ کے اخبار 'شحنۂ ہند' نے تیسرے اجلاس کے صدر جناب بدرالدین طیب جی کا مکمل خطبہ شائع کیا جس میں ملک کے تمام فرقوں کو کانگریس کی تحریک سے تعاون کرنے کی تلقین کی گئی۔ اس کے ایڈیٹر مولوی احمد حسن شوکت نے اس کی حمایت میں ایک اداریہ بھی لکھا۔

۱۸۸۹ء میں دیوبند کے شیخ محمود الحسن کی سرکردگی میں تقریباً ایک سو علماء کے دستخطوں

سے ایک فتویٰ جاری ہوا جس میں مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت کو جائز اور ضروری قرار دیا گیا۔

اسی زمانے میں مہاراشٹر سے بال گنگا دھر تلک نے سوراج کو ہندوستان کا پیدائشی حق قرار دیا اور اس کے حصول کو لازمی تصوّر کرنے کا مجاہدانہ اعلان کیا۔ وہ اپنے نظریے کی خاطر جیل کی قید بھی کاٹتے رہے۔ ان کی حراست اور اسی زمانے میں لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کی جلا وطنی نے دیسی بشمول اردو اخباروں کے کردار اور حوصلے پر بڑا مجاہدانہ اثر ڈالا۔ سوراجیہ کے لیے تلک کے ولولہ پرور اعلان نے وطن پرست حلقوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور بیسویں صدی اسی نئی روح کے ساتھ شروع ہوئی۔

اردو صحافت میں اس روح کی ترجمانی سب سے پہلے دبستانِ علی گڑھ کے ایک تازہ گریجویٹ فضل الحسن حسرت موہانی نے کی۔ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں اردوے معلیٰ کے نام سے ایک ادبی مجلّہ جاری کیا جس کا اعلانیہ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کا مذاق درست کیا جائے اور انھیں قومی سیاست میں تعمیری دل چسپی لینے کے لیے تیار کیا جائے۔ ایک ایسے وقت پر جب استبداد پرستی کا دور دورہ تھا اور حکومت برطانیہ کے خلاف معمولی سی نکتہ چینی بھی ایک باغیانہ حرکت تصور کی جاتی تھی انھوں نے اس مجاہدانہ ولولے اور حوصلے کا اعلان کیا کہ قومی سیاست کا مسلک کامل آزادی ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد کی تعلیم و تلقین کے لیے قید و بند کی دشوار ترین صعوبتیں قبول کیں اور اپنی صحافتی سرگرمیوں اور عملی زندگی سے اس طبقے کی ذہنی تربیت کی جس کے لیے ماضیِ قریب میں قومی سیاست کو ایک شجرِ ممنوعہ بنا دیا گیا تھا۔

اس وقت تقریباً پورے ملک میں نئی انقلابی لہریں چل رہی تھیں۔

پنجاب میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک صوبائی حکومت نے یکے بعد دیگرے ایسے زرعی قوانین نافذ کیے جن سے کسانوں کے حالات بد سے بدتر ہوئے۔ مثلاً ایک بل کے تحت جاری دوآب اور چناب کی نئی نہری آبادیوں کے آبادکاروں کے مالکانہ حقوق محدود کر دیے گئے اور انھیں اپنی آراضی کے بارے میں کوئی وصیت کرنے سے منع کر دیا

گیا۔ نہروں کے پانی کے مالیے کی شرح بڑھادی گئی ۔ پھر اراضی سے بے دخلی کے قانون LAND ALIENATION ACT کے تحت کسانوں کی مقروضیت کے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی جس سے ان کی پریشانی اور غربت میں مزید اضافہ ہوا۔ پھر اسی زمانے میں قحط کے علاوہ طاعون کی دبا پھوٹ پڑی لیکن حکومت نے لوگوں کی امداد اور راحت کے معاملے میں بے دلی برتی۔ زمین کے لگان میں کوئی کمی یا رعایت کرنے کی بجائے حکومت ہر نئی نہری آبادی کے قیام پر اس میں اضافہ کرتی رہی۔ ایسے کئی اقدامات نے کسانوں میں ناراضگی اور بے چینی کو فروغ دیا۔

اس بے چینی کو پنجاب کے کچھ اردو صحافیوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں نے قدرتی طور پر سیاسی رخ دیا۔ ان میں ایک نوجوان وکیل لالہ لاجپت رائے پیش پیش تھے انھوں نے ۱۹۰۴ء میں لاہور سے ایک ہفت روزہ "پنجابی" جاری کیا۔

یہ اخبار اگرچہ انگریزی زبان میں چھپتا تھا لیکن اس کی نظر اور تشویش بیش تر انھی مسائل پر تھی جو اس وقت پنجاب کے سرکردہ اردو اخباروں کی توجہ کا مرکز تھے۔ یہ اخبار اس وقت پنجاب کی صحافت کا نمایاں اور غالب حصہ تھا۔ ان میں 'ہندوستان' 'پیسہ اخبار' اور 'جھنگ سیال' پیش پیش تھے۔ ان اخباروں کے کالم اس وقت پنجاب کے کسانوں کے مسائل پر مرکوز تھے اور ان کی تحریروں نے ہندوستان کے کسانوں کی اس اوّلین اقتصادی تحریک کی راہیں ہموار کیں جن کی منزل سیاسی آزادی تھی۔

ان میں سے ہندوستان تو (اجرا ۱۹۰۴ء) انقلابیوں کی ایک تربیت گاہ اور درسگاہ کا کام کر رہا تھا۔

اس دور کے سب سے جری انقلابی اخبار 'سوراجیہ' کے اوّلین ایڈیٹر بابو شانتی نرائن بھٹناگر نے صحافت کی تربیت اسی 'ہندوستان' میں پائی۔ الہ آباد سے اپنا اخبار 'سوراجیہ' شروع کرنے سے پیشتر وہ 'ہندوستان' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے منصب پر کام کر چکے تھے۔ بعد میں بھی اس اخبار کی ادارتی ضرورتیں اکثر 'ہندوستان' ہی کے ادارے سے پوری کی جاتی تھیں۔ 'سوراجیہ' کے آٹھویں ایڈیٹر لدھا رام صوفی انبا پرشاد کے شاگرد تھے جنھوں نے مختلف اوقات میں ہندوستان اور اس کے ملحقہ اخبار انڈیا کی ادارت کی۔

'ہندوستان' اشاعت اور توقیر کے لحاظ سے اپنے دور کا ممتاز اور رہنما اخبار تھا

اس کے بانی لالہ دینا ناتھ اور رام بھج دت چودھری تھے۔ دونوں قومی کارکن تھے اور تحریکِ حریت میں پیش پیش تھے۔ دونوں کے خاندانوں کے کئی افراد جن میں رام بھج دت چودھری کی بنگالی اہلیہ سرلا دیوی چودھری بھی شامل تھیں، اس دور کی تحریکِ آزادی سے وابستہ تھے۔ ہندوستان کے پریس سے ایک اور اخبار ہفت روزہ انڈیا بھی چھپتا تھا جو ایک انتہاپسند اور خفیہ اخبار تھا۔ اس کی خفیہ طباعت کے جرم میں لالہ دینا ناتھ کو پانچ سال قید کی سزا ہوئی۔

۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے بنگال کی انتظامی تقسیم کا اعلان کیا۔ اس اعلان نے بدیشی راج تقسیم پرور ارادوں کو بے نقاب کر دیا۔ ان ارادوں کی مخالفت میں مشرق میں بغاوت کا نیا دریچہ کھل گیا جس کی ترغیب اور تیاری کے لیے بنگال میں خفیہ انقلابی جماعتوں نے جنم لیا۔ تقسیم کی مخالفت میں بنگال میں انقلاب کی ایک زبردست لہر چلی جس سے ناراض پنجاب خاص طور پر متاثر ہوا۔ اس لہر نے اپنے اظہار کے لیے خفیہ تحریکوں کی تدبیر اختیار کی۔ بدیشی راج سے بیزاری کا جذبہ سارے ملک میں موجود تھا۔ چنانچہ ان تحریکوں کا جال سارے ملک میں بچھ گیا۔ شمال میں دیوبند میں مدرسہ دارالعلوم پہلے ہی انقلابیوں کی ایک صف تیار کر رہا تھا۔ اب مہاراشٹر میں ہندو دھرم سنگھ۔ سنٹرل پراونسز میں بال سماج اور آریہ بندھو سماج، مدراس میں بھارت ماتا ایسوسی ایشن اور صوبجات متحدہ میں سورلجیہ گروپ کے نام سے ایسی پارٹیاں قائم ہوئیں۔ بنگال میں تو ایسی کئی پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے جگانتر پارٹی کی شاخیں بہار، اڑیسہ اور صوبجاتِ متحدہ میں بھی قائم ہو گئیں۔

انقلابی مہم کی توسیع کے اس پس منظر میں دسمبر ۱۹۰۶ء میں کانگریس کا ۲۲ واں سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ اس میں پنجاب کے لیڈروں نے بھی بڑی گرم جوشی سے شرکت کی۔ ان میں پنجاب کے اس وقت کے شعلہ بار مضمون نگار اور شہید بھگت سنگھ کے چچا سردار اجیت سنگھ اور صوبجاتِ متحدہ سے لاہور منتقل ہو جانے والے صحافی صوفی انبا پرشاد شامل تھے۔ یہ وہاں بنگال کے انقلابی صحافیوں اور لیڈروں سے ملے ان میں موتی لال گھوش، راش بہاری بوس، آربندو گھوش اور رمیش چندر دت شامل تھے۔ ان کے علاوہ لوکمانیہ تلک اور کل ہند شہرت کے دیگر انقلابی لیڈروں سے بھی تبادلۂ خیال ہوا۔

واپس آکر پنجاب کے ان لیڈروں نے فروری ۱۹۰۷ء میں ایک انقلابی جماعت

بھارت ماتا سبھا قائم کی۔ اس کے ممتاز ممبروں میں لال چند فلک (مالک بندے ماترم بک ایجنسی) ضیاالحق (ایڈیٹر پیشوا)۔ دین دیال بانکے (ایڈیٹر جھنگ سیال) سردار کشن سنگھ (سیاسی ورکر اور والد شہید بھگت سنگھ) سردار سورن سنگھ (سیاسی ورکر) اور جسونت رائے (ناشر پنجابی) شامل تھے۔

اس کے معاونین میں لالہ دینا ناتھ (ایڈیٹر ہندوستان)۔ لالہ پنڈی داس (ایڈیٹر انڈیا) اور رام بھج دت چوہدری بیرسٹر (ہندوستان) شامل تھے۔

بیرون جات سے ان کے معاونین میں بنگال کا ایک نوجوان انقلابی مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں جب الہلال شروع کیا تو ان کے سیاسی تعلقات معلوم کرنے کے لیے سراغرسانی کے محکمے نے وسیع تفتیش کی۔ ایم حسن کی انگریزی کتاب

"COMMUNAL & PAN ISLAMIC TRENDS IN COLONIAL INDIA" (DELHI-1981) P 88

کے مطابق اس تفتیش سے پتہ چلا کہ مولانا موصوف ۰۸-۱۹۰۷ء میں پنجاب میں فعّال تھے۔

سرکاری رپورٹ کے مطابق "وہ لاہور کی ایک انتہا پسند پارٹی کے سرگرم معاون تھے اور ان کے روابط امبا پرشاد، اجیت سنگھ اور پنجاب کے دوسرے انتہا پسندوں سے تھے؎ بنگال اور پنجاب کے انقلاب پسندوں میں جماعتی تال میل بھی تھا۔ بھارت ماتا سبھا کے ممبروں کے میمن سنگھ سہردستی کے ممبروں سے روابط تھے اور ان روابط کی پشت پر رام بھج دت چوہدری کی بنگالی بیوی سرلا دیوی تھیں جن دونوں کی شادی ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ حکومت ہند کے امور داخلہ کے محکمے کے سیاسی ریکارڈ بابت ۱۹۰۷ء (بستہ نمبر۱۹) میں بتایا گیا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۷ء کے اپنے نوٹ میں کریمنل سراغرسانی کے قائم مقام ڈائرکٹر سٹیونسن مور نے لکھا کہ "یہ خاتون (سرلا دیوی گھوشال) کئی برسوں سے قومی تحریک کی راسخ حامی ہے اور لاہور کے بیرسٹر رام بھج دت سے جن کے خیالات ان سے مماثل ہیں شادی کے بعد بنگال اور پنجاب کے شورش پسندوں میں ایک اہم رابطہ بن گئی ہے"۔ موصوفہ بنگال کے صف اوّل کے ایک سیاسی خاندان کی دختر تھیں۔ ان کے والد جانکی ناتھ گھوشال انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بانی اے او ہیوم کے قریبی دوست تھے اور ملک کے نئے سیاسی حالات سے وابستہ تھے۔

چنانچہ بنگال کے کچھ انقلابیوں نے ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان پنجاب اور

صوبجات متحدہ کے دورے بھی کیے۔ ان میں نرینڈرناتھ، بشمبر ناتھ، ہریش گھوش اور چندر کانت چکرورتی (جو بانک ٹالہ سازش کیس میں ماخوذ ہوئے) شامل تھے۔[۱۵]

۱۹۰۷ء میں پنجاب کے کسانوں کی بے چینی اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی اور پنجاب کے سرکردہ اردو اخبار اس کی مسلسل عکاسی کر رہے تھے۔ لالہ لاجپت رائے کا فعال ہفت روزہ 'پنجابی' بھی اس صف میں شامل تھا۔ اس اخبار نے کسانوں سے بیگار کرانے کے طریقے کے خلاف ایک اداریہ لکھا اور دو ایسے کسانوں کا واقعہ شائع کیا جو چند افسروں کے لیے بیگار کرتے کرتے تکان سے مر گئے۔ اس پر اس کے پرنٹر جسونت رائے اور ایڈیٹر اٹھاولے پر مقدمہ دائر کیا گیا اور ہر دو کو ڈھائی ڈھائی سال قید کی سزا ہوئی اردو اخباروں نے اس سزایابی اور اس پر احتجاج کرنے والے مظاہرین پر پولیس کے جبر و استبداد کی خبریں جلی انداز میں شائع کیں۔ اس سے پورے پنجاب میں حکومت کے خلاف ایک عوامی شورش بپا ہو گئی۔

بھارت ماتا سبھا کے ممبر پہلے ہی اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے حکام کی زیادتیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پنجاب میں انقلاب بپا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اردو اخباروں نے اس منصوبے کی تقویت اور ترقی کے لیے بھرپور تعاون کیا۔ سبھا کے ممبروں نے اپنے منصوبے اور پروگرام کی اشاعت کے لیے انقلابی پمفلٹ اور کتابچے بھی شائع کیے۔ ان مطبوعات نے حامی اخباروں کے ضمیموں کا کام کیا اور لوگوں کی سیاسی معلومات میں اضافہ کیا۔

خفیہ سرکاری ریکارڈ سے اس انقلابی لٹریچر کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل عنوانات کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت	از: اجیت سنگھ
۲۔ انگلی پکڑتے پہونچا پکڑا	"
۳۔ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو	"
۴۔ دیسی فوج ظفر موج	از: صوفی انبا پرشاد
۵۔ غدر	از: سورن سنگھ
۶۔ امانت میں خیانت	

۷۔ قومیں کس طرح زندہ رہتی ہیں از : سورن سنگھ اور کشن سنگھ
۸۔ قومی اصلاح از : سورن سنگھ
۹۔ سرکاری ملازمت از : لال چند اور کشن سنگھ

ان کے علاوہ اور بھی کتابچے تھے جن میں بال گنگادھر تلک کے لیکچر، ٹیپو سلطان کی داستان ۔جاپان کی ترقی اور روس میں زار شاہی کے زوال کے کوائف پیش کیے گئے تھے۔
ان کتابچوں کے مصنف یا تو اردو صحافی ہی تھے یا اردو اخباروں کے مضمون نگار۔
چنانچہ گوجرانوالہ کے انقلابی ہفت روزہ 'انڈیا' کے ایڈیٹر لالہ پنڈی داس نے جو سبھا کے رکن بھی تھے، برطانوی حکام کے کرتوتوں پر "شو شمبھو کا چیلا" کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کی پاداش میں اسے پانچ سال بامشقت قید کی سزا ہوئی۔
سبھا کے کچھ ممبروں نے صوبے کے مختلف اضلاع اور دیہات کے دورے کیے اور اپنا لٹریچر تقسیم کرنے کے علاوہ طلبا، کسانوں، محنت کشوں اور سپاہیوں وغیرہ کے جلسوں میں انقلابی تقریریں کیں۔

ان تحریری اور تقریری سرگرمیوں کے ذریعے انھوں نے نہ صرف فرنگی راج کی ناگواریوں کو بے نقاب کیا بلکہ مالیہ ادا نہ کرنے کی ایک کسان تحریک بھی چلائی۔
اس تحریک کے سلسلے میں ۲۲ مارچ ۱۹۰۷ء کو بھارت ماتا سبھا کا لاہور میں ایک جلسہ ہوا جس میں 'جھنگ سیال' کے ایڈیٹر بانکے دیال نے 'پگڑی سنبھال جٹا' کے عنوان سے پنجابی میں ایک گیت سنایا۔ یہ ایک بڑا فریادی گیت تھا جس میں کسان سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ فرنگی راج اس کی زندگی اور عزت کو پامال کر رہا ہے لہٰذا اسے اپنی دستار سنبھالنے کے لیے فعال اور سرگرم ہو جانا چاہیے۔ یہاں یہ دیکھنا مشکل نہ ہوگا کہ اس گیت میں مصحفی کے اس شعر کا تاثر گونج رہا تھا جس میں انھوں نے فرنگی کو ہندوستان کی دولت و حشمت کا غاصب کہا تھا۔

پگڑی ہندوستان کے اکثر حصوں میں عزت اور وقعت کا نشان رہی ہے اور بدیشی راج کی چیرہ دستیوں کے حوالے سے اسے بچانے کے لیے کئی دفعہ اپیل کی گئی۔ ۱۸۵۶ء میں جب اس راج نے اودھ کی سلطنت کو ختم کر دیا اور وہاں اپنا اقتدار مسلّط کر دیا تو لکھنؤ کے ایک جریدے 'طلسم لکھنؤ' نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے چار ماہ قبل جنوری ۱۸۵۷ء

میں اپنی ایک خبر میں لکھا تھا:

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھام لو دستار

بانکے دیال کا گیت بے حد مقبول ہوا بلکہ کسان تحریک کی مرکزی قوت اور محور بن گیا۔ دیگر اخباروں کے علاوہ ہفت روزہ 'زمیندار' کے ایڈیٹر میاں سراج الدین احمد نے بھی اسے اپنے اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیا اور کسان تحریک کی حمایت کی۔ اسی حمایت کی بدولت 'زمیندار' جس کا بانی حکومتِ پنجاب کا ایک سابق پوسٹ ماسٹر تھا، اپنی فدویت اور مسکینی سے نکل کر پنجاب کے اس وقت کے انقلابی اخباروں میں شامل ہو گیا اور پنجاب کی مجاہدانہ اردو صحافت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

کسانوں کو اپنی دستار سنبھالنے کی اپیل کرنے کے علاوہ بھارت ماتا سبھا کے ممبروں نے اپنے مضامین اور تقریروں میں لوگوں سے کہا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ فرنگیوں کا ۲۹ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے قابل ہو جانا اور اس کی دولت کو لوٹ کر اپنے ملک میں لے جانا ہمارے وطن کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ مانا کہ فرنگیوں کے پاس بندوقیں اور توپیں ہیں لیکن ۲۹ کروڑ لوگوں کا اتحاد اور عزم ان کی ساری طاقت کو بے کار کر سکتا ہے۔

سبھا کے بانیوں نے ملک کے تمام باشندوں کو ایک قوم تسلیم کیا اور اپنے وطن کو ماں کا درجہ دیا۔ اسی اعتقاد سے انھوں نے اپنی جماعت کا نام بھارت ماتا سبھا رکھا۔ اس کی کوئی مذہبی منشا یا لپیٹ نہیں تھی۔ اس کے ممبروں میں ہندو مسلم سکھ سبھی فرقوں کے لوگ شامل تھے۔

۱۹۰۷ء میں یہ تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر اقبال کا ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا۔ یہ ترانہ اصلاً ۱۹۰۴ء میں تخلیق ہوا تھا اور اقبال نے اسے سب سے پہلے لاہور میں نوزائیدہ انڈین ینگ مینز الیسوسی ایشن YOUNG MEN'S CHRISTIAN ASSOCIATION کے افتتاحی جلسے میں ترنم سے پڑھا تھا۔ اس جلسے کے ایک سامع محمد عمر (نور الٰہی) کے مضمون (آجکل، نئی دہلی، جنوری ۱۹۴۶ء) کے مطابق ڈاکٹر اقبال سے اس مفہوم کا ترانہ تخلیق کرنے کی فرمائش ہر دیال نے کی تھی جو ان دنوں گورنمنٹ کالج

لاہور میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ جنھوں نے بعد میں امریکہ جاکر مشہور انقلابی جماعت "غدر پارٹی" قائم کی۔ لاہور کے مسیحی ادارے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے YOUNG MEN'S CHRISTIAN ASSOCIATION کے جس کے وہ ممبر تھے، سکریٹری سے کسی بات پر جھڑپ ہوگئی تھی۔ بات نے طول پکڑا اور ہردیال نے اس ادارے کو چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لے کر نئی جماعت قائم کی۔ اسی جماعت کے افتتاحی جلسے کے لیے انھوں نے اقبال سے ایک قومی ترانہ لکھنے کے لیے کہا جو انھوں نے اسی دن لکھ دیا۔ یہ ترانہ اسی سال لکھنؤ کے رسالہ "اتحاد" کانپور کے رسالہ "زمانہ" اور لاہور کے رسالہ "مخزن" میں شائع ہوگیا اور تینوں رسالوں کے ایڈیٹروں نے اس پر ستائشی شذرات لکھے۔

۱۹۰۷ء میں یہ ترانہ لاہور کے شعرا کی توجہ کا پھر سے مرکز بنا اور اس کے ایک مصرعے: "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" سے ایک اور مصرعہ اس طرح اخذ کیا گیا: "ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا" اور اسی طرح پر کئی اور نظمیں اور غزلیں کہی گئیں۔ لاہور کے رسالہ 'اصلاحِ سخن' نے ستمبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں اس ترانے کی اشاعت کے عنوان کے لیے یہی مصرعہ استعمال کیا۔[۳۵]

لالہ لاجپت رائے کی جن کے انقلابی کردار کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی، جلاوطنی پر ملک کے سرکردہ اخباروں نے سخت احتجاج کیا۔ دہلی کے ہفت روزہ آفتاب نے بڑی دلیری سے اس کی مذمت کی۔ اس کے ایڈیٹر سید حیدر رضا دہلی کے ایک مجاہد صحافی تھے جنھوں نے ۱۹۰۷ء کے زمانے میں اپنی شعلہ بار تحریروں اور تقریروں سے دہلی کی صحافتی اور سیاسی زندگی میں بڑا معرکہ قائم کیا۔ حکومت اس کی سرگرمیوں سے بہت پریشان رہی۔ اس ذہین اور انقلابی ایڈیٹر نے دہلی میں انڈین نیشنل کانگریس کی کمیٹی قائم کی اور دہلی کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں شریک ہونے کی تحریک دی۔ مولوی محمد باقر کی شہادت کے تقریباً پچاس سال بعد اور بیسویں صدی کے عین آغاز ہی میں سید حیدر رضا نے دہلی کی اردو صحافت میں ایک دفعہ پھر تحریکِ آزادی کا چراغ روشن کیا۔ بعد میں انھیں کی روایت کو آصف علی اور مولانا محمد علی نے آگے بڑھایا۔

وزیرِ ہند لارڈ مارلے کی ہدایت پر نومبر ۱۹۰۷ء میں پنجاب کی تحریک کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور دسمبر ۱۹۰۷ء میں بھارت ماتا سبھا کے یہ لیڈر سورت میں کانگریس

کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ وہاں ان کی خدمات کی زبردست ستائش کی گئی اور ہندوستان کے قومی تاج کے ایک نشان کے طور پر اس انقلابی گروپ کے لیڈر سردار اجیت سنگھ کو ایک کلغی دار ٹوپی پیش کی گئی۔

خفیہ ریکارڈ سے مزید پتہ چلتا ہے کہ اس گروپ نے کانگریس کے دوسرے انقلابی لیڈروں سے ایک خفیہ میٹنگ کی جس میں انقلاب کے پروگرام کی حکمتِ عملی پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ ان لیڈروں میں آربندو گھوش، تلک، دلیش مکھ اور دیگر اصحاب شامل تھے۔ ڈاکٹر جوگندر سنگھ کے تحقیقی مقالے کے مطابق بھارت ماتا سبھا کے نمائندوں کے مشورے پر آربندو گھوش نے بمبئی اور صوبجاتِ متوسط کا دورہ کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پنجاب کی سبھا کی قیادت قومی سطح پر اثرانداز ہو رہی تھی۔

خفیہ ریکارڈ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے انقلابی گروہوں نے کلکتہ، ہری دوار، گوروکل اور پنجاب کے کئی شہروں کے دورے کیے۔

پنجاب کے جلسوں میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے شہیدوں کے کارناموں پر خصوصی پمفلٹ بھی تقسیم کیے گئے اور لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ تانتیا ٹوپے، کمار سنگھ اور لکشمی بائی کے نامتمام کام کو مکمل کریں۔

قدم قدم پر حکومت کی نگرانیوں، تلاشیوں اور سبھا کے اہم ممبروں کی گرفتاریوں کے باوجود یہ خفیہ تحریک تقریباً دو سال تک چلی۔ اس کے فعال ممبروں کو طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ معاون صحافیوں کے پریس ضبط کر لیے گئے۔ کئی ممبروں کو انڈیمان بھیج دیا گیا۔ کچھ ممبر اپنے کام کو جاری رکھنے کے لیے حکومت کے احکام کو پھلانگتے ہوئے مفرور ہو گئے۔ بعض ممبر غیر ممالک میں چلے گئے۔ ان میں سے صوفی انبا پرشاد کا فارس (ایران) میں سراغ مل گیا۔ حکومتِ برطانیہ نے اپنے اثر و رسوخ سے اسے اپنی حراست میں لے لیا اور اسے پھانسی دینے کا حکم جاری کیا لیکن پھانسی کی تاریخ سے ایک رات قبل صوفی صاحب نے اپنی کال کوٹھری میں سمادھی لگائی اور اپنے خالق سے جا ملے۔

اس تحریک کو بوجوہ کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن اس کی بدولت صحافیوں کے عملی جہاد سے ملک بھر میں جو سیاسی حرارت اور ہمت پیدا ہوئی اس نے بیسویں صدی کے پہلے ہی دہے میں انقلابی سرگرمیوں کا سہرا اردو صحافت کے سر باندھ دیا۔ اس دہائی

میں اردو صحافت نے ۱۸۵۷ء والے جذبے کو بحال کرنے اور نئی سیاسی بیداری کو فروغ دینے میں ٹھوس اور تاریخی کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو ناکام بنانے کے لیے گورے شاہی کے جبر و استبداد کی وجہ سے واقع ہونے والی اعتدال اور عافیت پسندیات کا زمانہ لد گیا اور برٹش راج سے نجات پانے کے لیے عرضیوں، اپیلوں اور کاغذی کارروائیوں کی بے اثری کو تسلیم کیا جانے لگا۔

اس ذہنی اور نفسیاتی انقلاب میں اور سرفروشی کے جذبات کو فروغ دینے میں اردو اخباروں اور صحافیوں نے بڑا مجاہدانہ کام کیا۔ حق تو یہ ہے کہ پنجاب کی بھارت ماتا سبھا کی ساری تحریک اردو میں سوچی گئی۔ اردو میں تصنیف اور تخلیق کی گئی۔ اردو اخباروں اور رسالوں میں پیش کی گئی۔ شروع تا آخر اردو صحافیوں کی مرہونِ منّت رہی اور ناکامی کے باوجود اردو کی انقلابی روایت کو مضبوط کر گئی۔

اس وقت پنجاب کی اردو صحافت جذبۂ آزادی سے اس قدر سرشار تھی کہ اس کے ایک داعی کو ایک سراسر سیاسی ماہ نامہ جاری کرنے کا شوق اور حوصلہ بھی پیدا ہوا اس کے مضامین اور منظومات سب کی نوعیت سیاسی ہوتی تھی۔ اس رسالے نے فرنگی حکومت کو مجاہدانہ لہجے میں بتایا کہ اس کے کسی ایسے قانون کی پابندی نہیں کی جا سکتی جو اصولِ راستی کے خلاف ہو۔

'آزاد' کے نام سے یہ رسالہ جنوری ۱۹۰۷ء میں لاہور سے نکلا اور اس کے بانی اور ایڈیٹر بشن سہائے آزاد تھے۔ اس کا اعلانیہ مقصد یہ تھا کہ ہر فرقے کے دانشور اور قلم کار کو ایک ایسا منبر فراہم کیا جائے جس کا مذہب ہندوستان اور عقیدہ ملک کی خدمت ہو۔ اس رسالے نے غلامی کے خلاف دلیرانہ نفسیات پیدا کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں صرف ایک ہی مثال پیش کروں گا جو مولانا امداد صابری کی کتاب 'روحِ صحافت' سے لی گئی ہے۔

پنجاب کی کسان تحریک کے دوران انگریزی حکام کی لاپرواہی سے ایک ہندوستانی کانسٹبل رفعت علی مفتون کی موت ہو گئی۔ لالہ لاجپت رائے کے ہفت روزۂ 'پنجابی' نے اسے ایک شہادت بیان کیا اور اس معاملے میں حکّام کی سنگدلی کی مذمت کی۔ حکومت نے اخبار کے منیجر اور ایڈیٹر کو بغاوت کے جرم میں جیل میں ڈال دیا۔

سرکار کے ایک پروردہ انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے ان کی سزا یابی پر خوشی کا اظہار کیا اور مزید مطالبہ کیا کہ اشتعال انگیز تحریروں کی روک تھام کے لیے لارڈ لٹن کا پریس ایکٹ پورے نافذ کر دیا جائے۔

اس کے جواب میں بشن سہائے آزاد نے اپنے رسالے میں لکھا؟ ہمارے گورے ہم عصر پر انگریزیت کی دھن یا رم کا نشہ سوار ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ ہندوستانی اب اس قسم کے قانون کے پابند نہیں ہو سکتے۔ قانون ہمارے لیے ہے نہ کہ ہم قانون کے لیے۔ اس لیے کسی ایسے قانون کی پابندی نہیں کی جا سکتی جو اصولِ راستی کے خلاف ہو۔"

"آزاد" نے "پنجابی" کی قومی خدمات کے اعزاز میں ایک خصوصی نمبر نکالا۔ اس رسالے کے قلم کاروں میں منشی محبوب عالم، شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی، لالہ لاجپت رائے، منشی شوبرت لال ورمن، منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی، مرزا محمد سعید دہلوی، مسٹر مشتاق احمد زاہدی دہلوی، خان بہادر سید اکبر حسین خاں سابق جج، حکیم برہم (ایڈیٹر ریاض الاخبار) تلوک چند محروم، خواجہ حسن نظامی، منشی جوالا پرشاد (ایڈیٹر اودھ اخبار) سردار بشن سنگھ (ایڈیٹر پولیس گزٹ) وغیرہ شامل تھے۔

اسی زمانے میں بابو شانتی نرائن بھٹناگر نے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے ہفت روزہ سوراجیہ جاری کیا جس کا مقصد ہی بغاوت کے جذبات کو فروغ دے کر غلامی کو ختم کرنے کی راہیں تیار کرنا تھا۔ اس اخبار کا ہر ایڈیٹر رضاکارانہ طور پر قید و بند کے مصائب کے لیے تیار رہتا تھا۔ اپنے تقرر سے قبل وہ یہ شرط منظور کرتا تھا کہ اس کی تنخواہ جَو کی ایک روٹی اور پانی کا ایک پیالہ ہوگا جو اسے جیل میں ادا کی جائے گی۔ یکے بعد دیگرے اس اخبار کے آٹھ ایڈیٹروں نے بغاوت کے جرم میں مقدمے، گرفتاریوں اور کالے پانی کی صعوبتیں جھیلیں۔ اس کے آٹھویں ایڈیٹر لدھا رام کو الہ آباد کے سیشن جج مسٹر رستم جی نے جب دس سال قید کالا پانی کی سزا سنائی تو اپنے فیصلے میں انھوں نے لکھا کہ یہ اخبار گو الہ آباد سے نکلتا ہے لیکن اس کے پسِ پردہ ایک پارٹی ہے جو پنجاب سے اس کے لیے روپیہ اور آدمی بھیجتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اشارہ بھارت ماتا سبھا کی طرف تھا۔

لدھا رام نے مارچ ۱۹۶۵ء میں جب کہ وہ حیات تھے، مولانا امداد صابری کو ان

کے ایک خط کے جواب میں بتایا کہ سوراجیہ اخبار انقلابی لوگوں کا اڈہ بھی تھا جہاں نوجوان رضا کار فیضان اور ولولہ پاکر انقلابی کاموں میں لگ جاتے تھے تاکہ اپنے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرا سکیں[11]

برطانوی حکومت کی پے بہ پے سختیوں اور سزاؤں سے یہ اخبار ۱۹۱۰ء میں بند ہوگیا۔

'سوراجیہ' کی اہمیت کا ایک اور نادر پہلو بھی ہے جس کا ہمارے مورخوں نے نوٹس نہیں لیا۔ ۱۹۰۷ء یعنی اس کے سال اجرا ہی میں اس اردو اخبار کے بین الصوبائی رابطے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انڈین نیشنل کانگریس نے ابھی تک جماعتی طور پر سرگرم تحریکِ حرّیت کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا لیکن اخبار کا عنوان لوکمانیہ تلک کی اس دَور کی اس تحریک سے آیا جس میں سوراجیہ یعنی آزادی کو ہندوستانیوں کا پیدائشی حق باور کیا گیا تھا۔ تلک کا اپنا لسانی اخبار "کیسری" سوراجیہ ہی کے مسلک کا مستحکم مجاہد تھا۔ تلک کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ "کیسری" کی روش پر ملک کے مختلف حصّوں سے کئی اخبار جاری کیے گئے:

> سوراجیہ چار زبانوں میں جاری کیا گیا، مراٹھی، تیلگو، اردو اور ہندی۔ یہ تمام اخبار ایک ہی جرم کی بنا پر حکومت کے عتاب کا نشانہ بنے۔[12]

اس کے جانباز ایڈیٹروں کے نام حسب ذیل تھے:

(۱) شانتی نرائن بھٹناگر، (۲) سری رام داس سورالیہ (۳) ہوتی لال ورما، (۴) بابو رام ہری، (۵) شام داس ورما، (۶) منی رام سیوک، (۷) نند گوپال چوپڑا، (۸) لدھا رام اور (۹) امیر چند بمبوال۔

دوسرا ایڈیٹر سری رام داس سورالیہ امرتسر کا باشندہ تھا۔ اخبار کی باغیانہ تحریروں کی وجہ سے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، وہ مفرور ہوگیا اور اخبار کے لیے چندہ فراہم کرتا رہا۔ بعد میں سوامی پرکاش آنند کے نام سے معروف ہوا۔ لاہور سے مجاہد اخبار بھیشم جاری کیا۔ اپنی انقلابی تحریروں کی وجہ سے کئی بار جیل کی قید کاٹی۔ انھیں کے ایک ساتھی پنڈت میلارام وفا ستاتن دھرم کے اخبار 'ویر بھارت' کے ایڈیٹر ہوئے۔ پرکاش آنند فارسی کا شاعر بھی تھا۔

'سوراجیہ' کے متعدد فائل نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں موجود ہیں۔ اس اخبار پر فرنٹیئر میل پریس دہرہ دون نے ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ اس میں شانتی نرائن بھٹناگر۔ بابو رام ہری (وفات ۱۰ر مارچ ۱۹۵۸ء) نند گوپال چوپڑہ۔ لدھا رام اور پنڈت امیر چند بمبوال کی تصاویر ہیں۔

۱۳ر اپریل ۱۹۵۸ء کو پہلا ایڈیٹر شانتی نرائن بھٹناگر اور آخری ایڈیٹر پنڈت امیر چند بمبوال پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کی کوٹھی پر ملے اور سوراجیہ کی داستان سنائی۔ اس وقت شانتی نرائن بھٹناگر کی عمر ۸۴ سال تھی۔[۱۱۶]

ان کے منصوبوں اور ولولوں میں حائل ہونے والے برطانوی جبر واستبداد کے پیش نظر کچھ مجاہدینِ آزادی غیر ممالک میں چلے گئے اور وہاں سے انقلاب پسند اخبار جاری کیے جن کے پرچے ہندوستان میں بھیجنے کے بھی انتظامات کیے گئے۔ صحافتی سرگرمیوں کے علاوہ ان مجاہدین نے اس دور کی ضرورت کے تحت، غیر ممالک میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے حق میں رائے عامہ تیار کرنے کی کوششیں بھی کیں۔

جنوری ۱۹۰۸ء میں لالہ رام ناتھ پوری نے امریکہ سے اردو کا پہلا اخبار ماہانہ 'سرکلرِ آزادی' جاری کیا جس کا مقصد امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کو اپنے حقوق کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے بارے میں لاہور کے 'ہندوستان' نے اپنے ۹ر مارچ ۱۹۰۸ء کے شمارے کی ایک خبر میں لکھا "ہم نے اس کے پرچے دیکھے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنے مقصد کو بڑی خوبی سے پورا کر رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب خود ہی لکھ کر چھاپتے ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجتے ہیں۔"

اپریل ۱۹۱۰ء میں مولوی برکت اللہ بھوپالی نے جاپان سے ماہنامہ "اسلامک فریٹرنٹی" جاری کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت ایک لعنت ہے۔ انھوں نے لکھا کہ "برطانوی حکومت ہی ہماری خستہ حالی، بربادی، ذلت اور غلامی کی ذمہ دار ہے۔" انھوں نے تلقین کی کہ مسلمانوں کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن انگریز کے خلاف کربستہ ہو جانا چاہیے اور "اس کا راستہ صرف ایک ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ہم وطن ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی انقلاب کی تنظیم کریں۔"

۱۹۱۰ء ہی میں بنگال کے انقلابی لیڈر بپن چندر پال نے لندن سے سوراج جاری کیا جو ہندی اور بنگالی میں چھپتا تھا اور اس میں ایک اور حصہ اردو کا بھی شامل کیا گیا۔

اسی طرح ترکی، فرانس، جرمنی اور کینیڈا سے بھی ہندوستانیوں کی ادارت میں قریباً چودہ اخبار جاری ہوئے جو سب کے سب ہندوستان میں آتے تھے اور جن سب کا داخلہ برطانوی حکومت نے حکماً بند کیا۔

لیکن ان میں سب سے معرکہ خیز ہفت روزہ 'غدر' تھا جو نومبر ۱۹۱۳ء میں یعنی پہلی جنگِ عظیم سے عین قبل کیلی فورنیا (امریکہ) سے لالہ ہردیال نے جاری کیا۔ موصوف برطانوی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرنے کے حق میں تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں امریکہ پہنچے اور امریکہ و کینیڈا میں مقیم ہندوستانیوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے غدر پارٹی قائم کی۔

راجہ مہندر پرتاپ (۱۸۸۶ء - ۱۹۷۹ء) جنھوں نے مولوی برکت اللہ خاں بھوپالی، مولانا عبیداللہ سندھی اور ڈاکٹر متھا سنگھ ایسے انقلابیوں کی رفاقت سے دسمبر ۱۹۱۵ء میں کابل میں ہندوستان کی پہلی عبوری حکومت قائم کی، اس حکومت کے قیام سے قبل غدر پارٹی کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔ اس زمانے میں وہ اپنی تحریک کے مفاد کی خاطر دسمبر ۱۹۱۴ء میں غیر ممالک میں چلے گئے اور انھوں نے لالہ ہردیال اور غدر پارٹی کے دوسرے لیڈروں سے تعلقات قائم کر لیے تھے۔[۲۲]

اخبار 'غدر' غدر پارٹی ہی کا ترجمان تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ایڈیشن اردو، ہندی، بنگالی، گورمکھی اور مراٹھی میں شائع ہوئے۔ بعد میں اس کا نام "ہندوستان غدر" کر دیا گیا۔ اس کے شمارے برما، سیام، شنگھائی، ہانگ کانگ، ملایا، سنگاپور وغیرہ میں مقیم ہندوستانیوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ ان سب ممالک میں پارٹی کی شاخیں قائم کی گئی تھیں۔ پارٹی کے معاونین میں کرتار سنگھ سرابھا، پنڈت رام چندر، مولوی برکت اللہ اور پنڈت جگت رام شامل تھے۔

ان دنوں جنگ کے آثار پیدا ہو رہے تھے، اور لالہ ہردیال نے اس موقع کو اپنے منصوبے کے لیے غنیمت جانا۔ انھوں نے اپنی پارٹی کی مدد سے ہندوستان میں پرچمِ بغاوت بلند کرنے کا پروگرام بنایا۔ اخبار کے پہلے ہی شمارے

میں مندرجۂ ذیل سوال وجواب شائع ہوئے :

آپ کا نام کیا ہے؟	غدر
آپ کا کام کیا ہے؟	غدر
غدر کہاں ہوگا؟	ہندوستان میں
غدر کیوں ہوگا؟	کیوں کہ لوگ اب برطانوی ظلم وستم کو مزید برداشت نہیں کرسکتے۔

جنگِ عظیم سے ذرا پہلے کوماگاٹامارو کا انقلابی واقعہ ہوا۔ اس واقعے نے غدر پارٹی کی تحریک کو مزید تقویت پہنچائی۔ حکومتِ برطانیہ نے باباگوردت سنگھ جالی کی رہنمائی میں کینڈا سے آنے والے اس نام کے جہاز کے تمام کے تمام ۳۷۶ ہندوستانی مسافروں کو کلکتہ پہنچنے پر گرفتار کرلیا۔ ان کا سامان چھین لیا اور انھیں زبردستی ایک ریل گاڑی میں ڈال کر پنجاب بھیجنے کی کوشش کی۔ مسافروں نے مزاحمت کی۔ وہاں فساد بپا ہوگیا جس میں برطانوی سپاہیوں نے ۱۸ مسافروں کو ہلاک کردیا اور باقی مسافروں کو جیل میں ڈال دیا۔ ان میں سے ۲۹ مفرور ہوگئے جن میں پرتھوی سنگھ آزاد اور باباگوردت سنگھ شامل تھے۔

اس واقعے میں مسافروں کے سامان کے ساتھ ان کی ایک کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم بھی ضبط کرلی گئی۔

یہ لوگ لالہ ہردیال کی غدر پارٹی کے حامی تھے اور پنجاب حکومت کے جبرواستبداد سے تنگ آکر وطن چھوڑ کر کینڈا روانہ ہوگئے تھے۔ لیکن حکومت کینڈا نے انھیں اپنے ساحل پر اترنے ہی نہ دیا۔ پنجاب کے اخباروں میں اس کی خبروں نے بڑی سنسنی پیدا کی۔ پورا ہندوستان اس واقعے سے تڑپ اٹھا اور پنجاب کی تحریک کو دبانے کے لیے بہت سے لوگوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

دوسرے لاہور سازش کیس کے ایک ملزم گلاب سنگھ نے اپنی کتاب UNDER THE SHADOW OF GALLOWS (پھانسی کے سائے تلے) میں بتایا کہ غدر پارٹی نے بغاوت کے اپنے منصوبے کے لیے سال بھر کے وسائل جمع کرلیے تھے۔ اس کے داعی اس منصوبے کا آغاز پنجاب سے کرنا چاہتے تھے۔

حکومت کی تدبیروں سے اس میں کچھ سرکاری مخبر داخل ہو گئے جنھوں نے لسے تارپیڈو کر دیا۔

پنجاب کے بدنام زمانہ گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے صوبے کے حالات پر اپنی ایک رپورٹ میں اعتراف کیا تھا کہ:

"اگر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی ۱۵-۱۹۱۴ء کی سازش کا قلع قمع نہ کیا جاتا تو ہم اپنی جنگ کے لیے تین چار لاکھ پنجابیوں کی بھرتی کر لینے میں مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتے۔"

انقلابیوں کے مبیّنہ جرائم پر مکمّل طور پر قابو پانے کے لیے دسمبر ۱۹۱۷ء میں جسٹس رولٹ کی صدارت کے تحت جو کمیٹی قائم کی گئی تھی وہ غدر پارٹی کی تحریک ہی کا شاخسانہ تھی۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے یکایک اعلان کیا کہ وہ طرابلس پر جس کی تمام آبادی مذہباً مسلمان تھی، قبضہ کر لے گا۔ جنگِ طرابلس شروع ہو گئی اور اس کے ایک سال بعد جنگِ بلقان شروع ہو گئی۔ بلقانی ریاستوں نے مغرب کے بڑے ممالک کی شہ پر جن میں برطانیہ نمایاں تھا' ترکی کے خلاف یہ جنگ کی جس کے سبب ترکی سے زیادہ تر یورپی مقبوضات چھن گئے۔ دنیائے اسلام پر یہ ایک بہت کڑا وقت تھا۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے خلاف بہت سخت ردِعمل ہوا۔ مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی اور مولانا آزاد اسی زمانے میں عوامی لیڈر بنے اور پورے ملک میں ان کے اخباروں اور تقریروں کا طنطنہ رہا۔

اس زمانے میں مسلم لیگ جس کا قیام ۱۹۰۶ء میں ہوا تھا' برطانوی اقتدار کی مخالفت کے معاملے میں کانگریس کے ساتھ تھی۔[۳۶]

ان دونوں جنگوں میں برطانیہ نے اسلامی ممالک کے مفاد کے خلاف تدبیریں کیں۔

اس موقع پر 'زمیندار' نے جو پنجاب کی کسان تحریک کے دوران صوبے کے انقلابی اخباروں کی صف میں شامل ہو چکا تھا اسلامی ممالک کے اخباروں سے حاصل کردہ دنیائے اسلام کی خبریں خصوصی اہتمام سے شائع کیں اور مغربی ممالک کی یک طرفہ مصلحت کوش نیوز سروس کو شرمندہ کیا۔ اس کے بانی ایڈیٹر میاں سراج الدین احمد کا ۱۹۰۹ء میں انتقال ہو چکا تھا اور اب ان کا نوجوان بیٹا اس کی ادارت کر رہا تھا۔

مولانا ظفر علی مجاہدانہ جذبے اور حوصلے سے سرشار تھے اور تحریر و تقریر دونوں کے دھنی تھے۔ اس پر مستزاد ان کی شعری فطانت تھی جس کی بدولت انھوں نے سیاسی نظم کو اردو صحافت کا امتیازی عنصر بنایا اور اپنی تیز و تند نظموں سے برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو بڑی بے باکی سے عریاں کیا۔ اخبار کی معرکہ خیز خبروں اور جوشیلی نظموں کی دھوم مچ گئی اور اس کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ جنگِ طرابلس شروع ہونے کے قریب ایک ماہ بعد اکتوبر ۱۹۱۱ء میں یہ روزانہ ہو گیا۔ جوں جوں یہ انقلابی سیاست میں آگے بڑھتا رہا اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ اخبار ایک شعلۂ جوالہ بن گیا۔ حکومت اس کی بڑھتی ہوئی آنچ کی تاب نہ لا سکی اور پے بہ پے اس سے ضمانتیں طلب کیں۔ ابتدائی دور میں زمیندار کو ۲۲ ہزار روپے ضمانتوں کی صورت میں جمع کرانے پڑے۔ پہلی جنگِ عظیم میں مولانا ظفر علی کو ان کے قصبہ کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ اخبار کی اشاعت بند ہو گئی۔

۱۹۱۹ء میں یہ پھر شروع ہوا۔ اس سال امرتسر میں جلیان والا باغ کا سانحہ ہوا اور زمیندار پھر اپنی شعلہ سامانیوں کے ساتھ صفِ اوّل میں آگیا۔ پھر برطانوی جبر و استبداد کا شکار ہوا۔ اس زمانے میں اخبار کے تقریباً ایک درجن ایڈیٹر گرفتار ہوئے اور قریباً بیس ہزار کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔

طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے مسلم ملکیت کے اخباروں میں مغرب کے سامراجی منصوبوں کے خلاف گہری نفرت اور بیزاری پیدا کی اور ان جذبات سے اسی سامراج کی مخالف قومی تحریکِ آزادی کو جس کی بنیادیں اپنی سرزمین میں قائم ہو چکی تھیں اور روز بروز مضبوط ہو رہی تھیں، ایک نئی سمت ملی۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفت روزہ 'الہلال' جاری کیا جس نے برطانیہ بیزاری کے اس ماحول میں تحریکِ آزادی کے قومی جذبات اور انقلاب کے ولولوں کو نئی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہ مولانا آزاد کے چھ سال کے غور و خوض کا ثمرہ تھا۔

انھوں نے ماضی کے تجزیے اور ایک بہتر مستقبل کے تصوّر سے ایک واضح سیاسی

نظریہ مرتب کیا تھا۔ اس نظریے کی اساس اہلِ وطن کی متحدہ کوششوں سے غیر ملکی غلبے سے نجات حاصل کرنا تھا۔

فرنگی حکومت کے خلاف اپنے جہاد پرور خیالات کی بدولت 'الہلال' نے جو صوری اور معنوی اوصاف سے مالامال تھا، تھوڑے ہی عرصے میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی اور اس کی اشاعت ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی جو اس زمانے میں ایک نہایت ہی غیر معمولی کامیابی تھی۔

اس اخبار کے مخاطب تو ہر خاص و عام تھے لیکن مولانا آزاد نے مسلمانوں سے بالتخصیص بات کی۔ ۱۹۰۵ء میں فرنگی حکومت کے ہاتھوں بنگال کی تقسیم کی ناکام اسکیم کے لیے چند مسلم طبقوں کی حمایت سے انھیں گہری کوفت ہوئی تھی۔ انھوں نے محسوس کیا تھا کہ سیاسی علاحدگی کی سرسید کی تحریک اور پھر آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل دونوں ان کے کردار اور مفاد کے لیے مضر ثابت ہوں گی۔

انھوں نے 'الہلال' میں "الجہاد فی سبیل الحریّت" کے عنوان سے اپنے سلسلۂ مقالات میں لکھا کہ ان مظاہر سے وابستگان کو آزاد ہندوستان کا مورّخ "بدبختی"، "پاکستان اور غیر ملکی حکومت کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے والا پتھر" قرار دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلمان کا سوال ایک بازی گر کا کھیل ہے اور یہ نظریہ کہ مسلمان تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں اس لیے ان کی سیاست یہ ہونی چاہیے کہ وہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لیں حریفِ شاطر کی ایک پر قیامت چال ہے[۲۷] غلامی سے نجات کو اوّلین ترجیح دیتے ہوئے انھوں نے فرقہ وارانہ سیاست کے ترجمانوں سے کہا کہ "ہندو میجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لیے دل سے نکال دیجیے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں القا کیا گیا تھا۔"[۲۸]

مولانا آزاد کے اس نظریے میں ایک دفعہ پھر متحدہ قومیت کی وہ سوچ ملتی ہے جو گذشتہ صدی میں مولوی محمد باقر نے 'دہلی اردو اخبار' میں پیش کی تھی۔ گویا ۵۵ سال کے بعد بھی وحدتِ مقصد کی رو اپنے پراسرار ڈھنگ سے تحریکِ حریت کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔

مولانا آزاد نے وطن کی وحدت اور آزادی کے لیے بنگال کے تقسیم مخالف ہندو

انقلاب پسندوں سے ربط واشتراک کیا۔

ان کے جذبۂ حرّیت اور تحریک پرور اسلوب تحریر نے 'الہلال' کو شعلۂ انقلاب بنا دیا۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار روپے کی پہلی ضمانت ضبط کر لی اور ۱۴ر اور ۲۱ر اکتوبر کا مشترکہ شمارہ ضبط کر لیا۔ اس کے بعد ۸ر نومبر کو 'الہلال' کا آخری شمارہ نکلا۔ اس سے دس ہزار کی نئی ضمانت مانگی گئی جو جمع نہ کرائی گئی۔ اخبار بند ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں دوبارہ نکلا لیکن مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے چھ ماہ کے بعد بند ہو گیا بہرحال اردو کی حرّیت پرور صحافت میں جو معیار اور مقام 'الہلال' نے حاصل کیا وہ آج تک کسی اور جریدے کو نہیں مل سکا۔

'الہلال' کے اجرا سے سات ماہ بعد فروری ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے نقیب 'ہمدرد' کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ ۱۳ر جون کو اس کا نام 'ہمدرد' کر دیا گیا۔ ان دنوں بلقان کی جنگ ابھی ابھی ختم ہوئی تھی جس میں ترکوں پر دوہرے مصائب نازل ہوئے تھے۔ کیوں کہ اس جنگ سے عین قبل وہ جنگ طرابلس کی آفتوں کا شکار ہو چکے تھے۔ مولانا کو اس سے گہرا اضطراب ہوا اور انھوں نے 'ہمدرد' میں مغربی طاقتوں کی سامراجی حکمتوں کو بے نقاب کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہندوستان پر فرنگی اقتدار کی بے باک مخالفت کی۔

اخبار کے صحافتی معیار اور اس کی جرأتِ اظہار نے اس کی مقبولیت میں یکایک اضافہ کر دیا اور ایک ہی سال کے اندر اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی۔ لیکن حکومت کو اس کی بے باکی گوارا نہیں تھی۔ اس نے ۱۶ر مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو نظر بند کر دیا اور اس کے ایک ماہ بعد 'ہمدرد' پر سنسر نافذ کر دیا۔ اگست ۱۹۱۵ء میں 'ہمدرد' بند ہو گیا۔ اس وقت مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے مولانا محمد علی اور ان کے اخبار کی شہرت آسمان پر تھی۔

۹ر نومبر ۱۹۲۴ء کو 'ہمدرد' دوبارہ جاری ہوا لیکن قلّتِ سرمایہ، مولانا کی بڑھتی ہوئی سیاسی مصروفیات اور بعد میں ان کی علالت کی وجہ سے یہ اخبار جاری نہ رہ سکا۔

بہرحال اس اخبار نے حصولِ آزادی کے لیے مجاہدانہ کردار اور بلند پایہ صحافت کا نیا معیار قائم کیا۔

مولانا محمد علی کی مثال بہت حد تک۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مماثل تھی۔ مولانا آزاد ہی کی طرح ان کے پاس بھی صحافت کا ایک واضح نظریہ تھا۔ اس کے مطابق اخبار کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی قوم کو فائدہ پہنچائے۔ کسی دوسری قوم کو نقصان نہ پہنچائے اور مذہبی مباحث سے مبرّا اور معرّا رہے۔

مولانا محمد علی آزادیٔ صحافت کے علمبردار تھے۔ انھوں نے صحافت کو پابند کرنے والے قوانین کے خلاف پے بہ پے مقالے لکھے۔ ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور وطنی سرگرمیوں نے انھیں اس دور کی تحریکِ آزادی کی قیادت عطا کر دی تھی۔

ابتدا میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے پکّے حامی تھے۔ تحریکِ خلافت میں مہاتما گاندھی کے رہبرانہ معاون تھے۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرنے والوں کے ساتھ تھے۔ حریّت نواز ہندو مسلم اتحاد کی خاطر چند شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب منظور کرنے کے حق میں تھے۔ لیکن — اور یہاں وہ مولانا آزاد سے جدا ہو جاتے ہیں۔ بعد میں ان کے نظریات بدل گئے اور وہ ایک ہی فرقے کے مطالبات پر مرکوز ہو گئے۔ ہمدرد مرحلہ بہ مرحلہ ان کے خیالات کی عکاسی کرتا رہا لیکن اس کی وحدت اور حریّت پروری کے دور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اس جنگ میں ترکی، جو اس وقت مسلمانوں کی واحد آزاد خود مختار سلطنت تھا اور خلیفۂ اسلام کا مسکن تھا، جرمنی کا حلیف تھا۔ جرمنی کو جنگ میں شکست ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے قسطنطنیہ پر فوجی قبضہ کر لیا اور موصل پر جارحانہ پیش قدمی کی۔ اس پر ہندوستان میں جا بجا زبردست احتجاج ہوا اور مذمتی جلسے ہوئے۔

ستمبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ کانگریس نے اپنے لیڈر مہاتما گاندھی کی قیادت میں تحریکِ خلافت سے تعاون کیا۔ اس سے ملک میں بے نظیر ہندو مسلم اتحاد قائم ہوا۔

حکومت سے عدم تعاون اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی متحدہ تحریک چلی۔ متحدہ جہادِ حریّت کا ایک نہایت انقلابی دور شروع ہو گیا۔ مسٹر گاندھی کی نئی قیادت نے آزادی کی تحریک کو ایک عوامی کردار عطا کر دیا۔ اردو صحافت میں جو ان دنوں عوام کے قریب ترین تھی، ولولہ پروری کا یہ ایک مثالی اور تاریخی زمانہ تھا۔

۱۹۱۹ء ہی میں ماہ اپریل میں امرتسر میں جو اُن دنوں اردو قارئین کے اہم علاقوں میں شامل تھا، جلیان والا باغ کا سانحہ ہوا جو بے حد المناک تھا۔ فرنگی حکام نے ایک جلسۂ عام میں رولٹ ایکٹ کے خلاف پرامن احتجاج کرنے والے نہتے لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ سینکڑوں لوگ موقع پر ہی مرگئے اور ہزاروں زخمی ہوگئے۔

اس سے پورے ہندوستان کی روح کانپ اٹھی اور ساری دنیا میں برطانوی مظالم کی مذمت کی گئی۔ وہ پنجاب جو بیسویں صدی کے آغاز ہی سے انقلابی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا تھا اب ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اس زمانے کے اردو اخبار تحریکِ آزادی کے ایک نہایت ہی معرکہ خیز اور اتحاد افزا دور کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ قربانی کو آزادی کی کلید سمجھا جاتا تھا اور فرنگی حکومت کو یہ تنبیہہ کی جاتی تھی کہ اس کے مظالم سے آزادی کے پروانوں کی تعداد یا عمر کم نہیں ہوگی اور شہادت کا سلسلہ حصولِ آزادی تک جاری رہے گا۔ لاہور کے رسالہ "آزاد" نے رفعت علی مفتون کی شہادت پر لکھا تھا۔

شہیدِ قوم ہو جانا ہی عمرِ جاودانی ہے
جو وقفِ ملک ہو بس وہ مبارک زندگانی ہے

جلیان والا باغ کے سانحے کے بعد امرتسر محبّانِ آزادی کا کاشی اور مکہ بن گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس وہیں ہوا اس کے علاوہ نہ صرف خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ بلکہ جمیعتہ علمائے ہند کا، جس کا قیام حال ہی میں نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ہوا تھا، باضابطہ اجلاس بھی امرتسر ہی میں ہوا۔

ان سب جماعتوں اور بالخصوص تحریکِ خلافت کی سرگرمیوں کی اشاعت کا جو امتیاز اور زور اردو اخباروں میں پیدا ہوا وہ تحریکِ آزادی کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس زمانے میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی سطح پر بھی ممکن اور پسندیدہ ہے۔ ہر اخبار ان جماعتوں کے اجلاسوں کی تقریروں اور قراردادوں کی تفصیلات پیش کرنے میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کرتا رہا۔

اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد میں وحدت تھی اور اس وحدت کا عنوان برطانیہ کی غلامی سے آزادی تھا کیونکہ برطانیہ اسلام اور ہندوستان دونوں

کے مفاد کا غاصب تھا۔ گاندھی جی کانگریس اور خلافت کمیٹی ہی نہیں بلکہ مسلم لیگ کی بھی ترجمانی کر رہے تھے۔ دوسری طرف پنڈت مدن موہن مالویہ، جگت گورو شنکر آچاریہ، سوامی شردھا نند، پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس اور لالہ لاجپت رائے ایسے ہندو دانشور بھی بقائے خلافت میں مسلمانوں کا پورا ساتھ دے رہے تھے۔[۹]

امرتسر کی خلافت کانفرنس کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلّق ہندوستانی مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے ان کا ایک وفد مولانا محمد علی کی سرکردگی میں انگلستان بھیجا جائے۔

وزیراعظم برطانیہ لائیڈ جارج نے اس وفد کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا اور ۱۹۲۰ء میں مسٹر گاندھی کی عدم تعاون اور علی برادران کی خلافت تحریکیں اپنے شباب پر پہنچ گئیں۔

لوگوں کے دلوں سے انگریزی عدالتوں کا وقار جاتا رہا۔ طلبہ نے سرکاری اداروں کی تعلیم ترک کر دی۔ سلسلۂ تعلیم میں قومی زاویے ابھر آئے۔ لاہور میں نیشنل کالج اور علی گڑھ میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا قیام ہوا۔

اردو اخبار اس مہم میں پیش پیش تھے اور فرنگی راج سے نجات پانے کے لیے ہندو مسلم اتّحاد کی ضرورت اور اہمیت کے معتقد اور مبلّغ تھے۔

۱۹۲۰ء میں جب ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو خلافت کے ساتھ ساتھ سوراج کو عدم تعاون کے مقاصد میں شامل کر دیا گیا۔ داخلی سیاست میں خلافت کمیٹی اور کانگریس برابر ایک متّحدہ پروگرام پر عمل کرتی رہیں۔

نومبر ۱۹۲۱ء میں جب برطانیہ کا پرنس آف ویلز ہندوستان آیا تو ان دونوں جماعتوں نے ان کا متّحدہ بائیکاٹ کیا۔ ایک زبردست احتجاجی تحریک چلی۔ فرنگی راج کے نمائندے کے بائیکاٹ کی اس تحریک میں کلکتہ سے مولانا آزاد کی نگرانی میں شائع ہونے والے ہفت روزہ 'پیغام' نے بہت گرم جوش کام کیا۔ مولانا آزاد نے خود ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کے افتتاحیہ اداریے میں ترکِ موالات کے فلسفے کی تشریح کی اور لوگوں کو عدم تشدّد پر کاربند رہ کر جدوجہد کو کامیاب بنانے کی تلقین کی۔ مولانا آزاد کے دستِ راست مولانا عبدالرزاق

ملیح آبادی، جو اس اخبار کی ادارت کر رہے تھے، اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے حرّیت پروری کے اسی جرم میں مسلسل قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔

خلافت کانفرنس کے کانگریس کی قومی تحریک سے الحاق کی بدولت اردو صحافت میں ایک نئی تمکنت اور توقیت پیدا ہوئی اور اس دَور میں اردو کے عہد ساز روزنامے جاری ہوئے۔ اس زمانے میں قومی تحریک سے وابستگی اخبار کی کام یابی کی ضمانت تسلیم کی جاتی تھی۔ چنانچہ 'زمیندار' اور 'ہمدرد' تو پہلے ہی اس میدان کے شہ سوار تھے۔ اب لاہور سے 'پرتاپ'، 'بندے ماترم'، 'ملاپ' اور 'سیاست' اور بمبئی سے 'خلافت' جاری ہوئے۔ یہ سب کے سب قومی جنگ کے سپاہی تھے۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں ترکی کی حکومت نے عہدۂ خلافت منسوخ کر دیا اور اپنے صدر مقام ترکی میں خلافت ختم ہوگئی۔ اس سے ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا جواز ختم ہوگیا۔ خلافت کانفرنس کی صفوں میں انتشار پیدا ہوگیا جس سے قومی تحریک کی مرکزیت متاثر ہوگئی۔ کچھ طبقوں نے اپنی توجہ فرقہ واریت کے فروغ پر مرکوز کر دی۔ خود کانگریس کی قیادت کا ایک طبقہ بھی اس کی تحریک میں عوامی شدّت لے آنے کے مرحلے پر اس سے الگ ہوگیا تھا اور فرقہ واریت کی نئی سیاست میں ان عناصر میں تال میل ہوگیا۔ اس اشتراک سے فرقہ واریت کا فروغ ۱۹۳۷ء میں اپنے شباب پر پہنچ گیا۔ اس موڑ پر مسلم لیگ تحریکِ آزادی کے قومی کردار سے بالکل لاتعلق ہوگئی۔

اس مرحلے پر اردو کے کئی ایسے اخبار مسلم لیگ کی صفوں میں شامل ہوگئے جو کل تک کانگریس کی قومی تحریک کے ساتھ تھے۔ اس انحراف میں مولانا ظفر علی کا 'زمیندار' پیش پیش تھا۔

اس زمانے میں علاحدگی پسندی کی تحریک آزادی کی تحریک کی رقیب ہوگئی اور سیاسی اختلافات کو ہوا دینے کے لیے سنسنی خیزی کے نئے معیار قائم ہوئے۔ فرقہ واریت کو جائز قرار دینے کے لیے ہر قسم کے ولائل اور اشتعال سے کام لیا گیا اور برطانوی حکومت نے حسبِ معمول اپنے انداز سے اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی۔

بہرحال ملک کے سیاسی احساس اور جذبۂ آزادی میں ایک سمت شناسی قائم ہو چکی تھی اور فرنگی راج سے نفرت اور بیزاری ہمہ گیر تھی۔ اس کی تہوں میں برطانیہ کی

ہندوستان کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا احساس موجود تھا جس کی تفصیل اس باب کے دوسرے حصے میں آئے گی۔ اس بیزاری نے تحریکِ آزادی کی اہمیت کو برقرار رکھا۔ اردو کے اکثر اخبار اس تحریک کی حمایت کرتے رہے۔

چنانچہ ۱۹۳۱ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں اردو صحافت پھر ہراول دستے میں تھی گجرال کمیٹی کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس تحریک کو دبانے کے لیے برطانوی حکومت نے جو تادیبی اقدام کیے ان کے تحت ۱۳۹ اخبار ماخوذ کیے گئے۔ ان میں سے ۱۳۰ کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں جن کی کُل مالیت ڈھائی لاکھ روپے تھی۔

۱۹۳۹ء میں جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کی مشاورت اور رضا کے بغیر اسے اپنی من مانی سے دوسری عالمی جنگ میں جھونک دیا تو محبانِ آزادی کی ترجمان انڈین نیشنل کانگریس نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ حکومت برطانیہ نے حسب معمول اس مخالفت کی پرواہ نہ کی۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں کوئٹ انڈیا QUIT INDIA کے جلی عنوان کے تحت تحریکِ آزادی کا فیصلہ کن دَور شروع ہوا۔ حکومت نے اس کے آغاز ہی میں پریس ایمرجنسی ایکٹ کے تحت سنسر شپ نافذ کردیا اور تمام اخباروں کے لیے یہ لازم قرار دیا کہ وہ تحریک کی خبروں کی اشاعت سے قبل ان کا معائنہ کروائیں۔ اس سے مطبوعہ اخبارات کی بنیادی آزادی اور اہمیت ختم ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ قلمی اور سائیکلو اسٹائلڈ اخبار جاری ہوگئے جن کی تقسیم خفیہ انداز سے کی گئی۔ ان کے مندرجات سینہ بہ سینہ ترسیل پذیر ہوتے تھے۔ یہ اخبار بھی حکومت کی ضبطی کی سزا سے بچ نہ سکے اور جہاں جہاں حکومت کو ان کے بارے میں کچھ پتہ چلا اس نے وہیں ان کا گلا گھونٹ دیا۔

اسی زمانے میں لاہور کے روزنامہ 'پرتاپ' نے سنسر کے حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنی اشاعت ہی بند کردی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے نہ صرف اس اخبار کے موقف کی حمایت کی بلکہ حکومت کو اپنا سنسر شپ کا حکم واپس لینے کے لیے کہا۔ پنجاب کے وزیر اعلا سر سکندر حیات نے پنڈت نہرو کے بیان پر متعدد اعتراضات کیے۔ پنڈت نہرو نے پرتاپ کی حمایت ترک نہ کی بلکہ اخبار کی متواتر وکالت کرتے ہوئے دو اور بیان جاری کیے۔ وہ تمام بیانات آزادیِ صحافت کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

ان دنوں پنجاب کے وزیراعلا سرسکندر حیات نے ایک مشترکہ دوست کی محفل میں پرتاپ کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن سے بالمشافہ کہا کہ آپ بیشک تحریری بیان داخل نہ کریں بس ذرا سا میرے کان ہی میں کہہ دیں کہ آئندہ آپ احتیاط سے کام لیں گے۔ لیکن مہاشہ جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ سنسرشپ کے حکم کو بغیر کسی شرط کے واپس لیا جانا چاہیے۔ اسے کوئی خوددار صحافت گوارا نہیں کر سکتی۔

آریہ سماج کے گوروکل گروپ کی سرپرستی میں یہ اخبار ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو لاہور سے جاری ہوا تھا اور اسی دن مہاتما گاندھی نے دہلی میں رولٹ ایکٹ کے خلاف اپنا ستیہ گرہ شروع کیا تھا۔ اس نے ستیہ گرہ اور کانگریس کی تحریک کے مقاصد کی اشاعت میں بڑا دلیرانہ کردار ادا کیا۔ اس کے اجرا کے بارہ ہی دن بعد اس پر سنسرشپ عائد کر دی گئی۔ اس وقت بھی اس کے مجاہد ایڈیٹر نے احتجاجاً اپنے اخبار کی اشاعت بند کر دی تھی۔ ایڈیٹر کو فوراً جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر جیل کے اندر بھی مہاشہ کرشن کی مجاہدانہ فطرت میں کوئی نقاہت یا لغزش نہ آئی۔ جب جیل کا سپرنٹنڈنٹ معائنے کے لیے وہاں گیا تو انھوں نے اسے نظرانداز کیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے انھیں خود تعظیمات پیش کرنے کے لیے کہا۔ ایڈیٹر نے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ ان کی جیل کی ہسٹری شیٹ میں لکھا گیا کہ "یہ قیدی نہایت گستاخ ہے اور کسی رحم کا مستحق نہیں"۔

حصولِ آزادی تک مہاشے کرشن کو دو مزید بار جیل کی قید ہوئی اور ان کے اخبار کی آٹھ بار ضمانت ضبط ہوئی۔ ان کے دونوں بیٹے ویریندر اور نریندر ۱۹۴۲ء کی جنگِ آزادی میں گرفتار ہوئے لیکن اس اخبار نے فرنگی حکومت کی مخالفت کبھی ترک نہ کی۔

۱۹۲۰ء میں لاہور سے روزنامہ بندے ماترم جاری ہوا جس کی تحریروں نے اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ آلیویر کی توجہ کھینچی۔

اس اخبار کے بانی لالا لاجپت رائے تھے جن کے جذبۂ جہادِ آزادی کے کارنامول اور قربانی سے بیسویں صدی کا بابِ اوّل عبارت ہے۔

'بندے ماترم' فرنگی راج اور اس کی فرقہ پرور تدبیروں کا سخت مخالف تھا۔ ۱۹۲۵ء کی خفیہ سرکاری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "بندے ماترم ایک انتہاپسند اخبار ہے جس کی اشاعت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں نہایت وسیع ہے۔ یہ عدم تعاون کا سب سے

کٹرحامی ہے اور اپنے اصول کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔" اسے حکومت نے کئی بار وارننگ دی۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں دو ہزار روپے کی ضمانت لی اور اس پر مقدمہ دائر کیا۔ پھر مارچ ۱۹۲۲ء میں ایک اور مقدمہ دائر کیا اور بعد میں دیوانی کے تین مزید مقدمے تھوپے۔

۱۹۲۰ء یعنی سالِ اشاعت ہی میں یہ اخبار حکومت کی سیاہ فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے لالہ جی کئی برس تک جیل کی قید کاٹ چکے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے جیل خانے کے جو ابتر حالات دیکھے تھے ان کی اصلاح کے لیے 'بندے ماترم' میں مضامین لکھے۔ فرنگی حاکم اپنی جیلوں کے بارے میں ان انکشافات کی تاب نہ لاسکا اور اخبار پر ہتکِ عزت کا مقدمہ لاد دیا۔ بندے ماترم خائف نہیں ہوا بلکہ مزید انکشافات شائع کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جس کی سفارشات پر جیلوں کی اصلاح کے لیے ایک قانون بنایا گیا۔

اس اصلاح کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے 'بندے ماترم' کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

۱۹۲۳ء میں لاہور سے مہاشہ خوش حال چند خورسند نے روزنامہ 'ملاپ' جاری کیا۔ اسے مہاتما ہنس راج کی قیادت میں کام کرنے والے آریہ سماج کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نے ابتدا ہی سے ہندو مسلم ملاپ کو اخبار کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا۔ ان کے بیٹے رنبیر نے جو سترہ اٹھارہ سال کی عمر ہی سے اس کے ادارتی عملے سے وابستہ ہو گئے تھے، اس کی سیاسی حرارت کو تیز کیا۔ وہ انقلاب پسند سردار بھگت سنگھ کی نوجوان بھارت سبھا کے سرگرم ہم نواؤں میں تھے۔ سبھا کی میٹنگیں اکثر 'ملاپ' ہی کے دفتر میں ہوتی تھیں۔

۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو صدر منتخب ہوئے۔ ان کی صدارت میں ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ اس موقع پر 'ملاپ' نے ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں رنبیر کا ایک مضمون "آزادی کے خاموش سپاہی" کے عنوان سے چھپا۔ اس میں ایسے مجاہدینِ آزادی کا ذکر کیا گیا، جن کا انکشاف فرنگی حکومت کو جس نے حال ہی میں بھارت ماتا سبھا اور غدر پارٹی کی انقلابی تحریکوں کا انسداد کیا تھا، گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ 'ملاپ' کا وہ خصوصی نمبر ضبط کر لیا گیا اور

اخبار کے ایڈیٹر مہاشہ خوش حال چند کو بغاوت کے الزام میں قید بامشقّت کی سزا ہوئی۔

دو برس بعد پنجاب کے گورنر پر گولی چلانے کی سازش کے الزام میں رنبیر پر بھی مقدمہ چلا۔ سشن جج نے انھیں موت کی سزا سنائی لیکن بعد میں ہائی کورٹ نے اسے خارج کر دیا۔

خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کے اس زمانے میں ۱۹۲۵ء میں جمیعتہ العلما نے دہلی سے ایک ہفت روزہ 'الجمیعتہ' جاری کیا۔ اس نے ان تحریکوں کی پرزور حمایت کی۔ چنانچہ اپنے ابتدائی زمانے ہی سے یہ اخبار برطانوی عتاب کا شکار ہونے لگا اور اسے کئی بار اپنی اشاعت مجبوراً بند کرنا پڑی۔ اس نے تحریکِ آزادی اور وحدتِ ہند کی پرجوش حمایت کی۔ ۱۹۴۷ء میں سرکاری پابندیوں کے خلاف احتجاج میں اس کی اشاعت معطل کر دی گئی۔

اس کے اہم ترین ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۳۰ء میں 'الجمیعتہ' ہی سے شروع کیا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں مجلسِ احرار کے سہ روزہ 'زمزم' کی ادارت سنبھالنے کے لیے لاہور چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کیا تو وہ لاہور چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے اور 'الجمیعتہ' کے نئے دور کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان ہی کی ادارت میں یہ اخبار دسمبر ۱۹۴۷ء میں روزنامے کی شکل میں پھر سے جاری ہوا۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں اس کی منتظم ٹرسٹ سوسائٹی نے مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کی اشاعت بند کر دی۔

۱۹۲۷ء میں لاہور سے پنڈت مدن موہن مالویہ کے دستِ راست سناتن دھرم سبھا کے لیڈر گوسوامی گنیش دت نے روزنامہ 'ویر بھارت' جاری کیا۔ یہ اخبار کانگریس کا حامی اور ہندو مہا سبھا کا مخالف تھا۔ اس کے ایک ایڈیٹر جناب جمنا داس اختر نے جو آج اردو صحافت کی ایک بزرگ ہستی ہیں، راقم کو بتایا کہ ہندو مہاسبھا کے لیڈر بھائی پرمانند نے 'ویر بھارت' کے ایک مضمون کی بنا پر اس پر ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا تھا۔

اردو کے مشہور شاعر پنڈت میلا رام وفا طویل عرصے تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔ ان کی سیاسی نظمیں "فرنگی سے خطاب" کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں۔ ان کی بنا پر اس اخبار کے ۲۲ مدیر گرفتار ہوئے۔

۱۹۴۲ء کی جنگِ آزادی میں 'ویر بھارت' کے ادارے کی طرف سے ہر مہینے دس ہزار روپے کی امدادی رقم گرفتار ہو جانے والے مجاہدین کے گھروں میں پہنچائی جاتی تھی۔

مذکورہ بالا اخبارات کے علاوہ 'تیج' دہلی (بانی سوامی شردھانند)، 'اتحاد' دہلی (ایڈیٹر مولانا امداد صابری)، 'شیرِ پنجاب' لاہور (ایڈیٹر امر سنگھ)۔ 'کیسری' لاہور (ایڈیٹر شیام لال کپور)، 'پارس'، لاہور (ایڈیٹر کرم چند)۔ روزنامہ 'ہند' کلکتہ (ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)۔ 'پیام' حیدرآباد (ایڈیٹر قاضی عبدالغفار)۔ 'اجمل' بمبئی (ایڈیٹر معین الدین حارث جامعی) اور متعدد دیگر اخبار تھے اور تقریباً ہر صوبے میں تھے، جنھوں نے اپنی خدمات اور قربانیوں سے آزادی کی جدوجہد کو مضبوط کیا۔

اس تحریک نے اردو زبان اور اردو زبان نے اس تحریک کو اس قدر متاثر کیا کہ تیس اور چالیس کے دہوں میں تقریباً ہر سیاسی اور سماجی جماعت نے اردو میں اپنا اخبار نکالنا ضروری سمجھا۔ بلکہ اس باب میں ثقافتی جماعتوں نے پہل کاری کی۔ آریہ سماج کے 'پرتاپ' اور 'ملاپ'۔ جیعتہ العلماء کے 'الجمیعتہ' اور سناتن دھرم کے 'ویر بھارت' کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کے بعد مسلم لیگ نے 'تنویر' مجلس احرار نے یکے بعد دیگرے 'احرار'، 'زمزم'، 'پاسبان' اور 'مجاہد'۔ اکالی پارٹی نے 'اجیت'۔ کمیونسٹ پارٹی نے 'قومی جنگ' اور ریڈیکل نسٹ پارٹی نے 'شہباز' کے نام سے اردو میں سہ روزہ یا روزانہ اخبار نکالے۔

کانگریس نے ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ سے پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں "قومی آواز" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جس نے اس کی مرکزی قیادت کی نمائندگی کے علاوہ اپنے صوبے کی اردو صحافت میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کا کھل کر مقابلہ کیا۔

کانگریس لیڈر پنڈت نہرو ہی کے ایما پر کانگریس مخالف مہاشہ کرشن کے فرزند ویریندر نے ۱۹۴۶ء کے اوائل میں پنجاب کی راجدھانی لاہور سے روزنامہ "جے ہند" جاری کیا جس میں کانگریس کی تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے جہادِ آزادی کے مشن کو نمایاں کیا گیا۔

متعدد اخبار دیسی ریاستوں کو، جنھیں برطانوی نظام نے اپنے تقسیم پسند مزاج کے تحت اپنی سلطنت کے اندر ہی باقی ملک سے الگ تھلگ ایک باجگزار گوشہ بنا رکھا تھا، قومی شیرازے میں لانے اور وہاں جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے جہاد کر رہے تھے۔ ان میں دہلی کا "ریاست" پیش پیش تھا۔ اس کا ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون والیانِ ریاست کی عیاشیوں اور عوام دشمن پالیسیوں کو بڑی جرأت سے بے نقاب کرتا تھا۔ ان

بے باکیوں کی وجہ سے وہ کئی مقدموں میں ماخوذ ہوئے۔ پندرہ بار گرفتار ہوئے اور قریباً آٹھ بار جیلوں کی ہوا کھائی لیکن ان کی ہمت یا چال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے مشن کو مقدّم رکھا۔

بجنور کا ثقہ قوم پرست اخبار "مدینہ" بھی برطانوی حکومت کی ان تقسیم پسند حکمتوں کا مخالف تھا۔ اس نے دیسی ریاستوں کے مصنوعی نظام کے بارے میں جو پیشین گوئی کی وہ حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی۔ اس کے ایڈیٹر حامد الانصاری غازی نے لکھا:

"ہندوستانی ریاستیں برطانوی شہنشاہیت کی بوسیدہ، خراب وخستہ اور پھٹی ہوئی گدڑی کی مانند ہیں۔ برطانوی شہنشاہیت کا نظام ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ کیا یہ ریاستیں اپنی موجودہ مطلق العنانی کے ساتھ باقی رہ جائیں گی؟ والیانِ ریاست نے کبھی اپنے ملک سے وفاداری نہیں کی۔ کبھی اپنی رعایا کی سود وبہبود کا خیال نہیں رکھا اور (انھیں) کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ان کے لیے حساب کا دن بھی آجائے گا اور انھیں رعایا کے مطالبے پر اپنا حساب چکانا پڑے گا۔"[14]

اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ دن آگیا۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو ریاستیں راجوں مہاراجوں کی مطلق العنانی سے نکل کر ملک کے عوامی جمہوریہ کا حصّہ بن گئیں۔

غلامی کا اندھیرا چھٹ گیا اور آزادی کا سورج طلوع ہو گیا۔ اس طلوع کے لیے اردو صحافت نے جو جاں فشانی، جگر سوزی اور قربانی کی راہ اپنائی، وہ تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے کالموں میں آزادی کی جدوجہد کی نہایت اہم تقریریں، قراردادیں اور یادداشتیں محفوظ ہیں۔ آزادی کی کوئی صداقت پسند تاریخ اس کی خدمات کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔ اسے فرقہ واریت کے اس رجحان سے مسلسل سابقہ رہا جسے فرنگی سامراج نے بڑی حکمت اور شاطری سے فروغ دیا لیکن یہ بیشتر حصولِ آزادی کے لیے سرگرداں رہی۔

حواشی

١۔ بحوالہ محمد عتیق صدیقی : ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) صفحہ ١١١
٢۔ ایضاً ص ۴٠٣
٣۔ ایضاً ص ٣۵٩
۴۔ ایضاً ص ٣٦٢
۵۔ ایضاً ص ٢٦٣
٦۔ بحوالہ ضیاالرحمٰن صدیقی : انقلاب ١٨۵٧ ، اردو صحافت کی روشنی میں۔ قومی آواز، نئی دہلی ١٩٨٧ ۔ ١١۔ ١٣
٧۔ محمد عتیق صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص ٣٨٣
٨۔ بحوالہ امداد صابری : ١٨۵٧ء کے مجاہد شعرا ، ص ١۴٨
٩۔ بحوالہ عتیق صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص ٣٩۴
١٠۔ J. NATRAJAN : HISTORY OF JOURNALISM p. 54
١١۔ بحوالہ عتیق صدیقی ، ایضاً ، ص ٣۵٧
١٢۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید : صحافت پاکستان و ہند میں ، ص ١۵٦
١٣۔ ایضاً
١۴۔ الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید ۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ١٩٧٩ء، ص ١٣١۔١٢٩
١۵۔ PREM NARAIN : PRESS & POLITICS (1885 TO 1905) NEW DELHI, 1968.
١٦۔ بحوالہ محمد عتیق صدیقی : سرسید احمد خاں ، ایک سیاسی مطالعہ ، ص ٢٨۴
١٧۔ SR. TIKAKER : SOME EMINENT EDITORS, NEW DELHI, P. 97
١٨۔ DR. JOGINDER SINGH DHANKI : BHARAT MATA SABHA PUNJAB PAST & PRESENT P.204
١٩۔ IBID

۲۰ گیان چند: ترانۂ ہندی کی کہانی - آجکل، نئی دہلی، ستمبر ۱۹۶۷ء - ص ۱۲

۲۱ امداد صابری: تاریخ صحافتِ اردو، جلد چہارم - ص ۹۷۸

۲۲ SR. TIKAKER : SOME EMINENT EDITORS, NEW DELHI, P. 97.

۲۳ عظیم فیروزآبادی: ہفت روزہ سوراجیہ، الہ آباد - ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی
۱۵ جولائی ۱۹۸۵ء

۲۴ اشوک چندر: بھارت کے پہلے راشٹرپتی کی جلاوطن زندگی - ہفت روزہ سینک سماچار، نئی دہلی - یکم نومبر ۱۹۸۷ء

۲۵ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید - صحافت پاکستان وہند میں - ص ۳۲۵

۲۶ ایضاً ص ۳۹۶ - ۳۹۴

۲۷ ایضاً

۲۸ ایضاً

۲۹ قاضی محمد عدیل عباسی - تحریکِ خلافت - قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۷ء
ص ۱۴۳ - ۱۴۴

۳۰ بحوالہ محمد سلیمان صابر: اردو کے اہم صحافی - اپنے اداریوں کی روشنی میں (اردو صحافت مرتب انور علی دہلوی - دہلی ۱۹۸۷ء - ص ۱۴۰)

فرہنگِ آصفیہ، مولفہ: سید احمد دہلوی

یہ اردو زبان کا وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو برسوں سے نایاب تھا۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی سنسکرت اور انگریزی کے وہ تمام الفاظ شامل ہیں جو اردو زبان کا جز بن چکے ہیں۔ اس لغت کی کچھ اہم خصوصیات یہ ہیں۔

- عدالتی الفاظ
- بیگماتی محاورات
- اہلِ پیشہ و اہلِ حرفہ کی ضروری اصطلاحات
- داخلِ روزمرہ ضرب الامثال
- اشارات و کنایات
- تاریخی واقعات
- مناسب حال مادے
- علمِ زبان کے رموز و نکات
- اردو صرف و نحو کے قاعدے
- ملک کی متداولہ رسمیں
- قدیم و جدید تحقیقات کے اختلافات مع نظائر
- نظم و نثر میں لفظوں کے کثیر المعانی استعمال کی مثالیں اور وجہ تسمیہ
- تمام اولیا اور فقرائے ہند کے اسمائے گرامی مع حالات
- علمائے کرام کے نام اور مختصر سوانحی حالات

علاوہ ازیں دیگر امور کی تشریحات بھی اس لغت میں درج ہیں۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ لغت ۵۵ ہزار سے زائد الفاظ کا بے مثال ذخیرہ ہے۔
فوٹو آفسیٹ سے شائع کردہ اس فرہنگ میں اصلی ایڈیشن کی بعض غلطیوں کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

سائز : 20x26/4

صفحات : ڈھائی ہزار سے زائد

قیمت : (مکمل تین جلدیں) 750 روپے

درج ذیل پتوں سے طلب کریں

قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان

ویسٹ بلاک 1، ونگ 6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Green House, 5-4-435/20, Station Road, Nampally, Hyderabad - 500001(A.P.)

شکیل جہانگیری

انعام اللہ خاں یقین

۱۷۰۰ء تک آتے آتے شمالی ہند میں جب اردو شاعری کو اعتبار حاصل ہوا تو دہلی کے کوچہ و بازار میں غزل گوئی اور غزل سرائی کا ماحول گرم ہوگیا۔ دربارِ شاہی میں اُردو کے مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ وہ شعراء جو فارسی میں شعر کہنے کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے، اُردو کی قوتِ اظہار کے قائل ہو کر اس عوامی زبان میں طبع آزمائی کرنے سے خود کو نہ روک سکے اور دیکھتے ہی دیکھتے دہلی میں اردو شاعروں کی ایک پوری کھیپ تیار ہوگئی جن میں شاہ مبارک آبرو، شاہ حاتم، مرزا مظہر جانِ جاں، شرف الدین مضمون، غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ، عبدالحئی تاباں، شاکر ناجی، جعفر زٹلی، عطاءاللہ زٹل، سراج الدین علی خاں آرزو، امیر خاں انجام وغیرہ کو اپنے دور میں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ایہام گوئی سے ہوا۔ بیشتر شعراء اپنے اشعار میں ذومعانی الفاظ لاتے جس سے معنی کی دو تہیں پیدا ہو جاتیں۔ ایک معنی قریب کا اور دوسرا دور کا لیکن شاعر کا مقصد دور کے معنی سے ہوتا تھا۔ مثلاً:

خوباں کو جاناتھا گری کریں گے مجھ سے ۔۔۔ دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
شاہ مبارک آبرو

خاصے سجن کا ملنا تن سکھ ہے عاشقوں کا ۔۔۔ گاڑھے رقیب مارے مرتے ہیں ہاتھ مَل مَل
شاہ حاتم

اس پری پیکر کو مت انسان بوجھ ۔۔۔ ٹک میں کیوں پڑتا ہے اے دل جان بوجھ
یک رنگ

ہر سیاِ آخر میں جو اپنے تئیں دانا کہے ۔۔۔ پیس ڈالے اس کو گردش میں فلک کی آسیا
شاکر ناجی

پپیہے کی طرح دارو کے شیشے زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی

سعادت

مے کدے میں گر سراسر فعلِ نا معقول ہے مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

شرف الدین مضمون

ایہام گوئی اس زمانے میں فیشن کے طور پر رائج ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جادو ہر شاعر کے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اس طرزِ شاعری کے نمائندوں میں آبرو، شاکر ناجی، شرف الدین مضمون، خان آرزو، غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ، امیر خاں انجام، شاہ حاتم اور سعادت کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

ایہام گوئی نے جہاں اردو شاعری کی لفظیات کو وسعت عطا کی وہیں اس سے یہ نقصان بھی ہوا کہ لوگ شاعری میں نئے معانی اور فنّی باریکیوں پر کم اور تلاشِ لغات پر زیادہ توجہ صرف کرنے لگے۔ دراصل یہ حضرات اُردو کے ادبی استعمال کے قائل نہیں تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک عوامی رابطے کی زبان تھی اور اس قابل نہیں تھی کہ اس کو تخلیق ادب کا وسیلہ بنایا جائے اس لیے محض تفریح کے طور پر یا تو اس کو طنز و مزاح نگاری کا ذریعہ بنایا یا لفظی بازی گری کا میدانِ محض ـــ حالانکہ دیگر صنائع کی مانند ایہام بھی ایک عمدہ صنعتِ شعری ہے لیکن اگر اس کو اسی طرح موقع بہ موقع استعمال کیا جاتا جس طرح دوسری صنعتوں کو تو کوئی بری بات نہیں تھی لیکن یہاں تو ساری کی ساری شاعری اس صنعت کی بھینٹ چڑھ رہی تھی لیکن جب ۱۷۰۰ء میں ولی اورنگ آبادی دہلی آئے اور ۱۷۲۰ء میں ان کا دیوان آیا تو ان کی شاعری نے دہلوی شعراء کی آنکھیں کھول دیں۔ پہلی بار انھیں احساس ہوا کہ اُردو میں اس قدر اعلیٰ معیار کی شاعری بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ولی نے اس زمانے کی مروجہ اُردو کے مقابلے میں نہایت صاف اور منجھی ہوئی زبان استعمال کی ہے جس میں چند متروک الفاظ کے استعمال کو چھوڑ کر کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا یہاں تک کہ ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جن کو آج کی شاعری کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے ـــ ولی نے اپنے زمانے کے تمام مروجہ شعری مضامین کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کر کے اُردو کی بے پناہ قوتِ اظہار کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں ـــ

اہلِ گلشن پہ ترے قد نے جب امداد کیا   اوّلاً سرکوں غلامی ستے آزاد کیا
اس کی تعظیم ہوئی اہلِ چمن پر لازم   بلبلِ باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا

ماہیٔ دل شکار کرنے کوں   کھول زلفا سجن نے جال کیا

صاف دل کوں اگر مدام رکھو   جامِ جمشید کا مقام رکھو
گر تمھیں تابِ انتقام نہیں   بے سمجھ مت کسی سے کام رکھو

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا   اس کوں پہاڑ ہووے کوہِ طور کا تماشا
اے رشکِ باغِ جنت تجھ پر نظر کیے سوں   رضوان ہووے دوزخ پھر حور کا تماشا

ولیؔ کے شعری اسلوب نے شمالی ہند کے شعراء کو بے حد متاثر کیا اور نتیجتاً بعض سربرآوردہ شعراء نے ایہام گوئی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا۔ اس ذیل میں سب سے نمایاں نام میرزا مظہر جانِ جاں کا ہے جنھیں عام طور پر لوگ مظہر جانِ جاناں کے نام سے جانتے ہیں۔

میرزا مظہر فارسی کے شاعر تھے اور اردو میں بہت کم شعر کہتے تھے۔ ان کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ایک انعام اللہ خاں یقینؔ تھے۔ یقینؔ نے ایہام گوئی کے خلاف اپنے استاد کی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی شاعری میں اس صنعت سے مکمل اجتناب برتا لہٰذا وہ پہلے شاعر ہیں جن کے دیوان میں ایہام کا شاید ہی کوئی شعر نظر آئے۔

یقینؔ کو ایہام گوئی کے مقابلے میں زبان کی صفائی اور مضمون کی پاکیزگی زیادہ عزیز تھی۔ وہ شاعری کو لفظ و معنیٰ سے ہٹ کر تسلیم نہیں کرتے۔ کہتے ہیں:

شاعری ہے لفظ و معنیٰ سے تری لیکن یقیںؔ   کون سمجھے یاں تو ہے ایہام مضموں کا تلاش

لہٰذا یقینؔ کو اگر اردو شاعری کا نجات دہندہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ یقینؔ کے بعد دوسرے بڑے شعراء نے بھی ایہام گوئی ترک کرنی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ صنعت دہلی کی اردو شاعری سے مفقود ہو گئی۔ غدر سے ذرا پہلے

رعایت لفظی کا کچھ اثر لکھنؤ سے دہلی پر پڑا تھا مگر وہ تھوڑے ہی دنوں میں زائل ہوگیا اور دہلی کی شاعری نے وہی رنگ اختیار کر لیا جو یقین اور اس کے معاصرین نے ڈالا تھا۔ یقین کے کلام کو دیکھ کر ان کی استادی کا ہر ایک قائل ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار اردو غزل کے اسلوب کو ایک نئی طرز سے روشناس کرایا۔ ان کے بیشتر اشعار، مضامین اور اسلوب کے اعتبار سے دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے ؎

یقین اس کے دُرِ دنداں کی باتیں جو کیا چاہے　　صدف کی طرح دھولے آبِ گوہر سے دہن اپنا

گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا　　مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا
نہ کہتی رازِ دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی؟　　فضیحت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا
مرے اِن آنسوؤں نے کھو دیا نورِ بصر میرا　　یہ یوسف بیچ کر اس کارواں کے ہاتھ کیا آیا

خال گورے منھ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا　　اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی لگتے ہیں چور

یقین کے اسلوبِ شاعری سے نہ صرف ان کے ہمعصر بلکہ بعد کے شعرا بھی اس قدر متاثر تھے کہ وہ یقین کے تتبع کو اپنی کامیابی کا ذریعہ گردانتے تھے جیسا کہ فرحت اللہ بیگ کا خیال ہے:

> "پہلے زمانے میں یقین کے جتنے تتبع کرنے والے تھے اتنے شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوں گے۔ بعضوں کا تو یہ حال تھا کہ اس کی غزل پر غزل کہنا باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اس کے دیوان کے مطالعے کو اپنی زبان کی اصلاح کا ذریعہ جانتے تھے۔ ان سب میں لچھمی نرائن شفیق پیش پیش تھے۔ لکھتے ہیں ؎
>
> ہم کو دیوان یقیں کی سیر ہے صاحب سدا　　بلبلوں سے چھوٹتا کب ہے گلستاں کا خیال" [14]

میر ہوں یا سودا، ذوق ہوں یا غالب سب نے کسی نہ کسی حد تک یقین کی اتباع کی ہے اور ان کے مضامینِ شعری اور اسلوبِ فن سے خوشہ چینی کی ہے۔ کلامِ یقین کے تتبع کا شوق تمام ہندوستان میں آگ کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ یہ شوق صرف شمالی ہند ہی تک محدود نہیں تھا، دکن میں بھی ان کے بہت پیرو تھے جن میں شیر سنگھ طہور،

سیتا رام عمدہ اور عبدالولی عزلت خاص طور پر نمایاں ہیں۔

یقین وہ پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں اُردو زبان نہایت صاف اور نکھری ہوئی شکل میں سامنے آئی ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ اشعار بیسویں صدی کی تخلیق ہیں ؎

یہ کوہِ طور سرمہ ہو گیا سارا ہی کیا کہیے ۔۔۔ کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا
اُڑا دی اس ہوا نے مشتِ خاکِ میکشاں ناحق ۔۔۔ غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا

دلبروں کے نقشِ پا میں ہے صدف کا سا اثر ۔۔۔ جو مرا آنسو گرا اس میں وہ گوہر ہو گیا
کیا بدن ہو گا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند ۔۔۔ برگِ گُل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا
آپ سے جب تک نہ تھا واقف کہاں تھا یہ شکوہ ۔۔۔ دیکھتے ہی آئینے میں منہ سکندر ہو گیا

تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانے سے کیا نسبت ۔۔۔ نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت
یہ جیوے ہجر میں وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا ۔۔۔ تکلّف برطرف بلبل کو پروانے سے کیا نسبت

یقین کے کلام کا نمایاں عنصر شوخیٔ ادا ہے۔ وہ سنجیدہ مضمون میں بھی شوخی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے ہیں ؎

مارے ہی جاتے ہیں آخر کوہ کن سے سر چڑھے ۔۔۔ خسروِ بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے

محبت کے مزوں کو کب ہر اک بے ہیچ داں سمجھے ۔۔۔ جو ابراہیم ہو آتش کدے کو گلستاں سمجھے
ستم ہے قید کرنا اس طرح سے مرغِ ناداں کو ۔۔۔ کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے

اگرچہ عشق میں آفت بھی اور بَلا بھی ہے ۔۔۔ نِرا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
یقین کا شورِ جنوں سن کے یار نے پوچھا ۔۔۔ کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے؟

بن چاک سینہ بیچ محبت کی جا نہیں — جس گھر کا در کھلا نہیں اس میں ہوا نہیں
کعبہ بھی میں گیا نہ گیا ان بتوں کا عشق — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

یقین کا کلام عوام و خواص میں بے حد پسند کیا جاتا تھا جس کے باعث انھیں زندگی ہی میں وہ شہرت حاصل ہوگئی تھی کہ لوگ ان کے سامنے میر و سودا تک کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ لہٰذا اِسی صورت حال کے پیش نظر کسی شاعر نے یہ رُباعی کہی جو کہ اس زمانے میں کافی مشہور تھی۔

جس طرح سے لاتے ہیں مضامین متین — اشعار میں ریختہ کے سودا و یقین
اب کوئی نہیں ہند میں ہرچند کہ ہیں — سجاد و کلیم و میر و درد و تمکین

"تذکرہ چمنستانِ شعراء" کے مؤلف پنڈت لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی جو کہ یقین کے بہت بڑے معتقد اور ان کے ہمعصر تھے، اس رُباعی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں۔

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا — کرے جو فکر تتبع یقین کا از دل و جاں
کہے گا معنیٔ باریک و خوب شیریں تر — ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں

اردو شاعری میں شاعرانہ تعلّی کا رواج شروع ہی سے رہا ہے۔ لہٰذا میر اگر کہتے ہیں کہ ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تو یقین ان کے مقابلے میں سینہ ٹھونک کر آتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں ؎

یقین تائیدِ حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے — مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے۔ کیا قدرت

یہ وہ زمانہ تھا جب میر و سودا کا سارے ہندوستان میں شہرہ تھا اور وہ خود کو اقلیم سخن کا بے تاج بادشاہ تصوّر کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے یقین جیسے نوعمر شاعر کو جب شہرت کی بلندیوں پر فائز دیکھا تو خاص طور پر میر کو ان سے خدا واسطے کا بیر ہوگیا۔ لہٰذا جب انھوں نے اپنا تذکرہ "نکات الشعراء" تالیف کیا تو اس میں یقین کے بارے میں ایسی باتیں درج کیں جن سے زمانۂ مابعد کے بہت سے تذکرہ نگار گمراہی کا شکار ہوئے۔ میر نے لکھا ہے:

" بعد از ملاقات این قدر خود معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد. شاید از همین راه مردمان گمان ناموزونیت در حق او داشتہ باشند جمعی براین

اتفاق دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست۔ چرا کہ شاعر این قسم کم فہم نمی باشد...“[4]
میر نے ایک افواہ یہ بھی اڑائی کہ یقین کا پورا دیوان ان کے استاد میرزا مظہر جانِ جاناں نے کہہ کر دیا ہے۔ ورنہ یقین تو ایک مصرع بھی موزوں کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن یقین کے بعض دوسرے ہمعصر شعراء نے میر کے اس بیان کی نہ صرف تردید کی ہے بلکہ یقین کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے ”چمنستانِ شعراء“ میں یقین کی تعریف میں صفحے کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔ جن میں یقین کو شہنشاہِ قلم روئے سخن داں، یوسفِ کنعانِ معانی، طوطیٔ شکر مقال، عندلیب ہزار داستان جیسے خطابات سے نوازا گیا ہے اور ان کے آگے میر و سودا کو کمتر قرار دیا گیا ہے۔ یقین کے ایک اور ہمعصر قدرت اللہ شوق اپنے تذکرے ”طبقات الشعراء“ میں لکھتے ہیں:

”مشقِ سخن او بہ پایۂ استادی رسیدہ بود فاما اجلش مہلت نداد۔ ہر قدر کہ دیوانش مرتب است ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست“[5]

میر حسن کا بھی یہی خیال ہے۔ ”تذکرہ شعرائے اردو“ میں انھوں نے لکھا ہے:

”اشعارش بسیار نمکین و موثر اند۔ سخنِ او خالی از دردمندی نیست“[6]

بعد کے تذکرہ نگار بھی یقین کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ”تذکرہ گل رعنا“ کے مؤلف عبدالحیٔ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہوں یا میرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا“[7] ”تاریخ ادبِ ہندوستان“ میں گارساں دِتاسی یقین کو ان کے اسلوب نگارش اور فنی مہارت پر اس طرح داد دیتا ہے۔

”یقین کے اشعار بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور پڑھنے میں بڑے بامزہ ہیں... پرانے زمانے کے ریختہ گویوں میں یقین ہی پہلا شخص ہے جو ہمیشہ اپنے خیالات کو نہایت پاکیزگی اور صفائی سے باندھتا ہے۔ جو لوگ اس کے بعد ہوئے ہیں انھوں نے اس بارے میں اس کا تتبع کیا ہے“[8]

یقین کا کلام نہ صرف ان کے زمانے میں مقبول تھا بلکہ آج بھی شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ان کی شوخیٔ کلام، متانتِ فکر اور جدتِ ادا سے متاثر ہیں۔ ان کی بحریں رواں

اور شگفتہ ہوتی ہیں۔ قافیے و ردیف پرلطف اور الفاظ و محاورات ایسے سیدھے سادے
کہ ذہن و دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ؎

زنجیر میں زلفوں کے پھنس جانے کو کیا کہیے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
اپنے نے کیا یہ کام بیگانے کو کیا کہیے

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق سامنے
زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اس زمینِ چمن کا نشاں نہ تھا

تو نہ تھا حیف یقین ورنہ دوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

کرے ہے آئینہ بے طرح نکتہ چینیٔ حسن
نہ کر تو اس کو اب اتنا بھی روبرو گستاخ

یقین کی ذہنی استعداد اور علمی قابلیت کے پیچھے ان کے خاندانی پس منظر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان کا تعلق اس مایۂ ناز بزرگ ہستی سے تھا جو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے نام سے تمام عالمِ اسلام میں مشہور ہیں۔ ان کے خاندانی حالات کے بارے میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے۔

"انعام اللہ خاں یقین (۱۱۴۰ھ میں) دہلی میں پیدا ہوئے اور ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو ایک طرف اپنے زہد و تقویٰ، بزرگی و نجابت میں مشہور تھا تو دوسری طرف دولت و ثروت۔ امارت و وقار میں نامور اور ممتاز تھا۔ اگر ان کے دادا شیخ عبدالاحد نقش بندی مجددی اپنے کمالات باطنی کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے تو ان کے نانا نواب حمیدالدین خاں اپنی شجاعت و بہادری کے باعث سلطنت کے رکنِ رکین مانے جاتے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب اگر ددھیال کی طرف سے چوتھی پشت میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اور تینتیسویں واسطے سے خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ تک پہنچتا تھا تو ننھیال کی طرف سے چوتھی پشت میں باقی خاں قلماق چیلہ شاہجہانی سے جا ملتا تھا۔

شیخ عبدالاحد کے فرزند شیخ اظہر الدین سرہند چھوڑ کر دہلی آئے۔ یہاں آپ کے خاندانی فضائل کا ہر شخص معتقد تھا۔ سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواب حمید الدین خاں نے اپنی صاحب زادی کی شادی آپ سے کر دی اور اس طرح دونوں خاندانوں میں بیعت کے سلسلے کے علاوہ دنیاوی سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔"[۵]

یقین چونکہ ایک متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے لہٰذا ان کی تعلیم اس زمانے کے امیروں اور نوابوں کے مقررہ معیار کے مطابق نہایت توجہ اور اہتمام کے ساتھ ہوئی۔ انھوں نے اپنی فطری ذہانت اور قابلِ رشک قوتِ حافظہ کی بنا پر بہت جلد علومِ متداولہ میں خاطر خواہ استعداد حاصل کر لی۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کو اردو و فارسی کے اساتذۂ سخن کا بیشتر منتخب کلام ازبر ہو گیا تھا۔ طبیعت موزوں تھی لہٰذا خود بھی شعر کہنے لگے تھے۔[۶] چونکہ میرزا مظہر جان جاناں سے گھریلو مراسم تھے اس لیے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور باقاعدہ اصلاح لینے لگے۔ میرزا مظہر کو یقین سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے یقین میں پوشیدہ غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کو پہچان لیا تھا۔ ایسے قابل اور شفیق استاد کی سرپرستی میں یقین کا فن خوب پروان چڑھا اور وہ اپنے استاد کی نظروں میں دیگر شاگردوں سے ممتاز مقام پا گئے۔ یقین بھی میرزا مظہر کی شاگردی پر ہمیشہ فخر کرتے اور ان کو انتہائی عقیدت و احترام سے یاد کرتے۔ کہتے ہیں ؎

جوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقین ۔ حضرت استاد یعنی شاہِ مظہر کی ثنا

یقین کی زندگی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں لیکن ان کے اشعار سے ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ ان کا دلِ نازک کسی کے تیرِ نظر کا شکار ہو گیا تھا۔ ان کے کلام کا سوز و گداز اور وارداتِ قلبی کا اظہار ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ کیفیات محض تخیل کی دین نہیں بلکہ ان کے پسِ پردہ یقین کا اپنا تجربہ بھی کارفرما ہے ؎

یہ دل ایسا خرابِ کوچہ و بازار کیوں ہوتا ۔ اگر ملتا نہ تنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا

ہیں زخم مرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا ۔ اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سے کیا ہوگا

کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینے کو آتی ہیں ۔ دل سے نہ ہوا جو کام آئینے سے کیا ہوگا

خوباں یقیںؔ کو معذور اب تو دکھو کر اس کے — لوہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نین میں

عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا — نالۂ شہور غلط ہے کہ رسا ہوتا ہے

کیا ہے عشق ہم نے تجھ سے ہمدم کے بھروسے پر — خدا کے واسطے اے آہ اُس دل میں اثر کیجو

دوانہ مجھ سا کب جیتا ہے کیوں تدبیر کرتے ہیں — کوئی دن چلنے پھرنے دیں عبث زنجیر کرتے ہیں

یقیںؔ عشق میں ان تمام مراحل سے گزرے ہیں جو ایک عاشقِ صادق کا مقدر ہوتے ہیں۔ کبھی وہ محبوب کے سراپا اور اُس کی اداؤں میں گم ہیں تو کبھی اُس کے اندازِ تغافل سے دل برداشتہ۔ کبھی فراق کی طویل مدتیں ان کو مایوسی کا شکار بنا دیتی ہیں تو کبھی ان کا جذبۂ صادق عشق پر ثابت قدم رہنے اور محبوب پر خود کو قربان کر دینے پر اُکساتا ہے۔ وہ عشق میں برباد ہونے کو باعثِ فخر جانتے ہیں اور درد کو زندگی کی ایک عظیم نعمت ؎

یہ سینہ عشق سے محرومِ درد و داغ نہیں — ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

اُٹھا اُس منہ سے اے بادِ صبا گھونگھٹ کے آنچل کو — توجہ سے تری ہم بھی تنک اک یہ گلستاں دیکھیں

اُس بسنتی پوشش سے آغوش رنگیں کیجیے — جی میں ہے اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے
عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جیوں کوہکن — جانِ شیریں دیجیے تب خوابِ شیریں کیجیے

درد بن ہم کو کچھ اس آگ سے مقصود نہیں — عشق پھیکا ہے اگر زخم نمک سود نہیں

کیوں چاہتے ہو میرے تپِ عشق کا زوال — یہ درد خود دوا ہے اسے پھر دوا نہیں

یقیںؔ کے اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ انھوں نے اپنے پیش رو اساتذۂ سخن سے استفادہ کیا ہے لیکن اس میدان میں وہ ان سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے یہاں وہ عیوبِ شاعری بہت کم پائے جاتے ہیں جن سے ان کے پیش رو اور ہمعصر استادوں

کا کلام بھرا پڑا ہے۔ اگرچہ تعقیدِ لفظی و معنوی، متروک الفاظ کا استعمال اور فارسی محاورات کا غیر فصیح استعمال اس زمانے میں کسی حد تک قابلِ برداشت مانا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود یقینؔ ان عیوب سے کافی حد تک بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انھوں نے شعری روایات سے استفادہ ضرور کیا لیکن نقالی سے اپنا دامن داغ دار نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے بعض فارسی اشعار کے مضامین استعمال کیے ہیں لیکن وہ محض ترجمہ نہیں بلکہ انفرادی اسلوب کے ساتھ نیا بن لے کر شعر کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلوب شعری کو کافی حد تک دوسرے شاعروں سے ممتاز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تشبیہات و استعارات تازہ اور اچھوتے ہوتے ہیں۔ محاوروں کا استعمال جتنا یقینؔ کے یہاں پایا جاتا ہے، ان کے پیش روؤں کے یہاں نہیں ملتا۔ اگرچہ یقینؔ نے خود کو ایہام گوئی سے دور رکھا تھا لیکن چونکہ یہ ایک شعری صنعت تو ہے ہی اس لیے ان کے چیدہ چیدہ اشعار میں اس کا بھی استعمال ملتا ہے۔ رعایتِ لفظی کی چند مثالوں کے سوا ان کے کلام میں کہیں کوئی اُلجھاؤ نظر نہیں آتا۔ اپنے اسی امتیاز کے باعث وہ بعض اساتذہ کی نظروں میں کھٹکنے لگے تھے۔

یقینؔ کو چند مخصوص تلمیحات سے بہت گہری نسبت تھی جن کو وہ اپنے اشعار میں بار بار نظم کرتے ہیں۔ ان میں شیریں فرہاد، یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں کی تلمیحات انھیں بہت پسند تھیں۔ سب سے زیادہ جس تلمیح کو انھوں نے اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے وہ شیریں فرہاد کا قصّہ ہے۔ خدا جانے اس کے پیچھے یقینؔ کا کون سا نفسیاتی عنصر کام کر رہا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

کس سے سیکھی تھی یہ شیریں کار فرما نے کی طرح
پھوڑ ڈالا کوہ کن سے لعل کو پتھر سے ہائے

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں
جو میں ہوتا بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

یقیںؔ ہم واں اگر ہوتے تو اک دَو دُو کہن کرتے
کوئی فرہاد جیسے بے زباں کو قتل کرتا ہے

یقیںؔ فرہاد کو دکھ سے چھڑانا اس کو لازم تھا
زبانِ تیشہ خسرو کو قیامت تک دُعا کرتی

یقین کو شیریں و فرہاد کی تلمیح کچھ اتنی زیادہ مرغوب تھی کہ اپنے مختصر سے دیوان میں ۲۸ جگہ انھوں نے اس قصّے کو نئے نئے پہلوؤں سے باندھا ہے۔ حتیٰ کہ ایک غزل تو ان کی ایسی ہے کہ جس کے پانچوں اشعار میں اس تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نہ آبِ تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر ملا سکتا — اس آب و رنگ سے کب نقشِ شیریں کو بنا سکتا
اجل تھی کوہ کن کی وہ جو صورت باندھ آئی تھی — وگرنہ یہ خبر کوئی بھی دشمن کو سنا سکتا
یہ عشقِ سر شکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا — وگرنہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا
اجل نے کوہ کن کی خوب رکھ لی شرم خسرو کی — وگرنہ اس کے سنگ زور کو یہ کب اُٹھا سکتا
اگر تیشہ نہ کرتا دست گیری اُس بچارے کی — یقیں فرہادِ تیغِ کوہ کے کب منہ پہ آسکتا

یقین نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو اپنے چاروں طرف ایک ایسی فضا دیکھی جس میں زندگی سے فرار کے نظریات بکھرے پڑے تھے۔ تصوّف اس دور کا محبوب ترین موضوع تھا۔ بیشتر شعرا بے ثباتیٔ دنیا کے مضامین بہت خوق سے باندھتے تھے۔ لیکن یقین کے یہاں یہ رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی اساس زیادہ تر معاملاتِ حسن و عشق پر ہے۔ وہ ایک عاشق خستہ حال ہیں اور اسی لیے ان کے کلام میں اوّل تا آخر ایک رومانی فضا پائی جاتی ہے۔ وہ دنیا کی نیرنگیوں اور رعنائیوں سے بے زار نہیں بلکہ ان سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی آرزو رکھتے ہیں لیکن بعض پابندیوں کی بنا پر ان کی یہ آرزوئیں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتیں۔ انھیں سیرِ چمن کی شدید تمنّا ہے لیکن پا بہ زنجیر ہیں۔ ان کے اشعار سے ایسا لگتا ہے کہ وہ اس لذّت سے آشنا ہیں اور بار بار اس سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں لیکن بقول ان کے ؎

باغباں بے رحم اور در بند، دیواریں بلند — بلبلِ بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح

یقین کی خود اعتمادی اور خودداری نے انھیں کبھی کسی کے آگے جھکنے نہیں دیا۔ جو لوگ استادی کا دعویٰ کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ یقین ان کے در کی جبہ سائی کرے لیکن انھوں نے کبھی ان اساتذہ کی برتری کو تسلیم نہیں کیا۔ کہتے ہیں ؎

ہم سے گر سر نہ نوا اہل تکبر کا تو کیا — فخرِ آدم ہے جو ابلیس کا مسجود نہیں

یہی وجہ ہے کہ یقین کو اپنی مختصر زندگی میں بہت ساری سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی

ان کے شاعر ہونے سے انکار کیا گیا تو کبھی ان کے کردار کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن انصاف پسند تذکرہ نویسوں نے ظاہری شکل و صورت کے ساتھ ان کے کردار کی خوبصورتی کا بھی اعتراف کیا ہے۔

یقین جیسا ذہین و باصلاحیت شاعر اگر پوری عمر پاتا تو خدا جانے فنِ شاعری کو کن بلندیوں پر پہنچاتا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ بعمر ۲۹ سال ۱۱۶۹ھ میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ وفات کے وقت دو بیٹے اپنے پیچھے چھوڑے۔

یقین کی موت آج تک ایک معما بنی ہوئی ہے۔ اتنا تو سب بتاتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہوئے لیکن اس قتل کی وجہ پر کوئی روشنی نہیں ملتی۔ سب نے قیاس آرائیاں کی ہیں اور ایسی قیاس آرائیاں کہ بیان سے باہر ہیں۔ بیشتر تذکرہ نگاروں کا قیاس یہ ہے کہ یقین سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو گیا تھا جو خاندان کی رسوائی کا سبب بن سکتا تھا۔ اس رسوائی سے بچنے کے لیے باپ نے بیٹے کو قتل کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یقین کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے والد کے ہاتھوں قتل ہوں گے تبھی تو کہتے ہیں ؎

چھٹے ہم زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

یقین کے قتل کی اور بھی کئی وجوہ قیاسی طور پر بتائی جاتی ہیں لیکن غالب گمان یہی ہے کہ ان کو جرم محبت کی پاداش میں قتل کیا گیا ؎

یقین مارا گیا جرمِ محبت پر زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں

حواشی

۱؎ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ دیوان یقین (مقدمہ) مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۰ء ص ۷۸

۲؎ ایضاً ص ۱۰

۳؎ ایضاً ص ۸۰

۴ میر تقی میرؔ۔ نکات الشعراء۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۵ء۔ ص ۸۲
۵ قدرت اللہ شوق۔ طبقات الشعراء۔ بحوالہ مرزا فرحت اللہ بیگ، دیوان یقین۔ ص ۶۴
۶ میر حسن۔ تذکرہ شعراء اُردو۔ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۹
۷ عبد الحیٔ۔ گلِ رعنا۔ مطبع معارف۔ اعظم گڑھ۔ ۱۳۵۲ھ۔ ص ۱۸۸
۸ گارساں دتاسی۔ تاریخ ادب ہندوستان بحوالہ: فرحت اللہ بیگ۔ دیوانِ یقین، ص ۶۵
۹ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ دیوانِ یقین (مقدمہ) علی گڑھ۔ ۱۹۲۰ء، ص ۱۰
۱۰ مختلف شواہد کی بنیاد پر قیاس کیا گیا ہے۔ (ش۔ ج)

اُردو اِملا

رشید حسن خاں

- لفظوں کا صحیح املا کیا ہے؟
- اس کے اصول کیا ہیں؟ یہ بڑے اہم سوالات ہیں۔ اُردو میں ان پر انفرادی طور پر اور اُردو تنظیموں کی سطح پر غور کیا گیا ہے۔
- اس عہد میں رشید حسن خاں نے بے پناہ غور و فکر کے بعد اس علمی موضوع کا جائزہ لیا ہے۔
- 706 صفحوں کی اس کتاب 'اُردو اِملا' کا دوسرا ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے شائع کیا ہے۔

قیمت 135 روپے

آج ہی طلب کریں

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔۱، ونگ۔6، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔006 110
فون : 6179657, 6103936, 6103381 : فیکس : 6108159
حیدرآباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد۔500002

حفیظ اللہ نیولپوری

اڑیسہ کے ایک گمنام صوفی شاعر:
مولوی محمد سلطان راجی

مولوی محمد سلطان ایک صوفی المسلک بزرگ تھے۔ راجی تخلص کرتے تھے۔ مولوی محمد حسن کے خلیفہ تھے۔ مذہبی تبلیغ اور رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ دکن کے شہر کٹک میں وارد ہوئے۔ ان کے اسلاف کے حالات کا کوئی علم ہو نہیں سکا۔ شہر کٹک کے بخشی بازار میں ایک مسجد تعمیر کروائی جو آج سلطانیہ مسجد یا مولوی صاحب کی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ مسجد کی موجودہ عمارت ۱۲۸۱ھ میں تعمیر ہوئی۔ مسجد کے حوض میں مندرجۂ ذیل اشعار تانبے کے پلیٹ میں کندہ ہیں:

جوں کرد بنا بہرِ خدا شیر علی بیاں
ایں حوضِ طرحدار زخوش انداز دلآویز
از تائیدِ حق سالِ بنا راجی ہمیں گفت
انچہ لبالب کہ شد حوضِ دلآویز

۱۲۷۹ھ

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولوی سلطان راجی انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں کٹک میں زمانۂ دراز سے مقیم تھے اور دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولوی سلطان راجی نے فریضۂ حج ادا کیا تھا۔ مسجد کے حجرہ میں قیام کرتے تھے اور عبادت و ریاضت، تصنیف و تالیف میں مصروف رہا کرتے تھے۔ عربی و فارسی کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں مندرجۂ ذیل کتابوں کے مطبوعہ نسخے محمد رفیق (ایڈوکیٹ) کے پاس محفوظ ہیں:

۱۔ فصیح الحلال والحرام۔ مطبوعہ مطبع مظہر العجائب مدراس۔ ۱۲۸۲ھ۔ ص ۶۰
۲۔ مجموع خطبہائے دوازدہ ماہی۔ مطبوعہ مطبع مظہر النصائح کٹک۔ ۱۲۸۶ھ۔ ص ۳۷۶

۳۔ معرفت خدا و رسول یطبوعہ مطبع مظہر النصائح کٹک ۔ ۱۲۸۷ھ ۔ ص

۴۔ مہتاب المجالس یطبوعہ مطبع مظہر النصائح کٹک ۔ ۱۳۰۳ھ

مولوی سلطان راجی کی تاریخ وفات کے سلسلے میں کٹک کے ایک شاعر عبد الغفور کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی وفات ۲ رجادی الاوّل ۱۳۱۴ھ کو ہوئی اور سلطانیہ مسجد سے متصل اپنے حجرہ میں مدفون ہوئے ۔ مذکورہ اشعار کی نقل پیشِ خدمت ہے :

کیے رحلت ہیں مولوی سلطان — خلد میں پائے ہیں وہ عالی مکان
پیر حاجی و عارف و اکمل — سالکان و عابد و افضل
زہد و تقویٰ میں تھے بہت کامل — اور عالم تھے فاضل و عاقل
روز شنبہ دوم جمادی الاوّل — تیرہ سو چودہ ہجری تھا کامل
اے غفور سالِ ہجری تونے کہا — جو کہ سچ تھا زباں سے حق نکلا

اردو کے کسی تذکرہ میں سلطان راجی کا کوئی ذکر نہیں ملتا حتیٰ کہ اڑیسہ کے شعرائے اردو کے تذکرہ "آبِ خضر" میں بھی ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

"مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" دراصل ساٹھ خطبوں کا مجموعہ ہے جو خانہ کعبہ کے خطیب نے سال کے ہر مہینہ کے لیے جاری کیا تھا۔ حافظ احمد کبیر صاحب کی فرمائش پر سلطان راجی نے تمام خطبوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۷۶ صفحات پہ مشتمل ہے۔ کتاب کے اختتام پر سلطان راجی نے لکھا ہے :

"مجموعہ شصت خطب جمع تمام سال کہ برائے ہر شہر از شہور سال پنج پنج خطب جداگانہ و دو خطبۂ عیدین از خطیبِ بیت الحرام و مدینہ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بموجب ارشاد مخدوم انام قدوہ کرام جناب حضرت مولانا تاج الحرمین حافظ احمد کبیر صاحب مدظلہ العالی برائے خطبائے اہلِ اسلام حنفیہ بجیز طبع درآوردہ خطیب را باید کہ اولی دریافت نماید ایں ہمہ کہ مذکور شد صرف یک یک خطبہ ہر جمعہ و ہر عید است واما خطبہ دیگر کہ بعد نشستن ساعتے خوانده می شود ان یک خطبہ کہ ہرائے تمامی خطب جمع و عیدین کافی است در آخیر مجموعہ منطبع گردید فقط و ہر جا کہ اعوذ باللہ الخ مندرج است آنجا اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بخواند دیگر مخفی نماند ایں خطبہا کہ مطبوع شدہ بودند

بغیر ترجمہ بودند چونکہ بعضے احبا مصر شدند بریں کہ ترجمہ کردہ شود تاکہ از واقف شدن مطالب نصایح و وعظ مندرجہ نفع خلایق است پس بنا بر اصرار احبا ترجمہ مطالب مالوف را بہ لباس نظم آوردہ شد الا آیت آخیر ہر خطبہ و خطبۂ ثانی را ہر حال بگذاشت زیراکہ واقف شدن از مطالب آیات قرآنی فقط از ترجمہ میسر نہ آید و خطبۂ ثانی کہ در ہر جمعے اکذا خواندہ شود بار بار حاجت ترجمہ ندارد و نیز سبب طوالت بار عظیم خواہد شد بدرجہ کراہت خواہد رسید۔ تاریخ و سنہ طبع ثانیہ کہ ترجمہ با منظومہ شد ایک ہزار و دو صد ہشتاد و ہفت بود۔ ۱۲۸۷

بتاریخ یکم ماہ ربیع الاوّل در مطبع مظہر النصایح واقع شہر کٹک مطبوعہ گردید۔ واللہ الہادی وہو الموافق ۔ مترجم مولوی محمد سلطان است ۔ مہتمم مطبع سوداگر فخر الدین است۔[1]

مذکورہ بالا کتاب میں مشتمل ہر خطبہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ عربی میں ہے اور دوسرا حصہ منظوم ترجمہ ہے جس میں سلطان راجی کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے سلطان راجی نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں کہیں رعایتِ شعری سے بھی کام لیا ہے ۔ بہر حال ان کے اشعار کو محض شاعری کے تناظر میں دیکھا نہیں جاسکتا بلکہ اڑیسہ میں اردو کے ارتقا میں مذہبی لٹریچر اور تبلیغ کے توسط سے سلطان راجی کی ادبی خدمات کا محاسبہ کیا جاسکتا ہے۔ راجی صرف اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے شاعری کرتے تھے پھر بھی ان کے کلام نے عرصۂ دراز سے عوامی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کے کلام میں مذہبی یکسانیت و مناسبت ان کے داخلی جذبات کا پُر خلوص اظہار کہا جاسکتا ہے۔

پہلا خطبہ "الخطبۃ الاولی لشہر عاشورا الحرام" ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ الحمد للہ مقدر الشھور والاعوام و مجدد الدھور والایام ۔ الی آخ

حمد حق کو کہ مقدر مہینے اور اعوام کا ۔۔۔ اور مجدّد ہے زمانوں کا اور ایام کا

سال کا حق نے شروع ماہ محرّم سے کیا ۔۔۔ اور چھ دن میں زمین و آسماں پیدا کیا

قصد پیدا کرنے کا پھر عرش کو بعد از کیا ۔۔۔ ایک ہے اور لا فنا ذات اس کی اے دوستا

اور گواہی دیں کہ نہیں ہے کوئی خدا اس کے سوا ۔۔۔ ایک ہے وہ نہیں شریک اس کا کوئی اور دوسرا

---

[1] مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی ؛ مولوی سلطان راجی ؛ مطبوعہ ۱۲۸۷ھ ۔ ص ۳۷۱

نئیں ہے کوئی اللہ مگر وہ بادشاہ پاکتر — حمد میں اس کی کروں حمد کثیر ہر وقت پر
یہ شہادت ہے ذخیرہ روزِ عقبیٰ کے لیے — صدق سے ظاہر و باطن کے جو کوئی اس کو کہے
اور گواہی دوں کہ سردار نبی مولا ہے کا — ہیں محمد بندے اس کے اور رسول رہنما
ہیں نبی ایسے کہ بھیجا ان کو رحمت کے لیے — اب جماعت حاضرین کو ہے بشارت جانیے
اب تمہارے آگے آیا ہے دیکھو سال جدید — پہلا مہینا ہے محرم سال کا ماہِ حمید
حق کیا اس کو مقرر فضل اور تعظیم سے — آئے اس کے فضل پر اخبار بھی تکریم سے
نیک لوگاں کرتے ہیں تعظیم اس کی بایقیں — ہے بشارت واسطے اس کے سنو اے اہلِ دیں[1]

پہلے خطبہ میں اس قبیل کے کل ۲۲ اشعار ہیں جن میں نئیں بجائے نہیں، لوگ کی جمع لوگاں کتیں بجائے کو استعمال کیا ہے۔

دوسرے منظوم خطبے کا آغاز مندرجۂ ذیل اشعار سے ہوتا ہے: اس خطبے میں کل ۲۸ اشعار ہیں:

حمد اللہ کو کہ بیشک بادشاہِ جلیل ہے — اور بڑا ستار ہے بھی اور شاہِ جمیل ہے
کرنے والا ہے بلند وہ قبۂ افلاک کو — اور زینت دینے والا ہے ستاروں سے سنو
اور بچھانے والا ہے گا وہ زمیں کو ذلیل کر — نیچے قدموں کے بچھانے والا ہے تذلیل کر
خاص و عام ور جیں اس روز مبارک کو دیا — اور دیا اس کو بزرگی اور فضیلت کی عطا
اور گواہی دوں کہ نئیں ہے کوئی خدا اس کے سوا — ایک ہے اور بھی شریک اس کا نئیں کوئی دوسرا[2]

ماہِ محرم کے تیسرے خطبہ میں کل ۳۱ اشعار ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کشادہ مکان سے وہ تجھ کو پھر لے جاوے گا — قبر کی تنگی میں جو ہے وحشت و ہیبت کی جا
ڈالے گا پھر تجھ کو کونے میں سیاہ ظلمت بھرا — بس اکیلا ہووے گا اور نئیں مصاحب پاوے گا
پس آہ اس ارواح پہ ہے جو کر دنیا سے گیا — راحتِ عقبیٰ کو دنیا سے نہیں کچھ لے گیا
اس گرفتار بلا چاہتا ہے گر اپنی صفا — محنت و سختی کے گھر میں گر کیا چاہے بھلا
پس یہ دنیا تئی نئیں اور نئیں رہے گی بے خطا — دوستی میں اس کے نئیں ہے بہتری کچھ اے فتیٰ
کوئی بھی تم لوگ سے باقی نہ رہنے پاوے گا — جو یہاں پیدا ہوا آخر کو سب مر جاوے گا[3]

---

[1] مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی: ص ۵-۶
[2] ایضاً : ص ۱۱
[3] ایضاً : ص ۱۸

مولوی محمد سلطان راجی نے "مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" میں ۶۲ خطبوں کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کیا ہے جس کی تفصیلات کا جائزہ راقم الحروف کے مرتب کردہ ذیل کے گوشوارہ سے لیا جا سکتا ہے۔

مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر	مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر
محرم	پہلا	۲۳	۷ - ۵	جمادی الاول	پہلا	۳۶	۱۳۰-۱۲۷
"	دوسرا	۳۸	۱۴-۱۱	"	دوسرا	۲۶	۱۳۵-۱۳۳
"	تیسرا	۳۱	۲۰-۱۷	"	تیسرا	۳۱	۱۴۱-۱۳۸
"	چوتھا	۲۵	۳۱-۲۳	"	چوتھا	۳۶	۱۴۷-۱۴۴
"	پانچواں	۳۲	۳۳-۳۰	"	پانچواں	۲۹	۱۵۳-۱۵۰
صفر	پہلا	۳۰	۳۹-۳۶	جمادی الثانی	پہلا	۴۱	۱۶۰-۱۵۶
"	دوسرا	۳۳	۴۵-۴۲	"	دوسرا	۴۳	۱۶۷-۱۶۳
"	تیسرا	۳۵	۵۲-۴۹	"	تیسرا	۲۵	۱۷۲-۱۷۰
"	چوتھا	۲۴	۵۷-۵۵	"	چوتھا	۲۹	۱۷۸-۱۷۵
"	پانچواں	۲۵	۶۱-۵۹	"	پانچواں	۲۸	۱۸۳-۱۸۰
ربیع الاول	پہلا	۳۳	۶۸-۶۵	رجب	پہلا	۳۹	۱۸۹-۱۸۶
"	دوسرا	۴۰	۷۵-۷۳	"	دوسرا	۳۵	۱۹۵-۱۹۲
"	تیسرا	۳۱	۸۱-۷۸	"	تیسرا	۲۸	۲۰۱-۱۹۸
"	چوتھا	۵۴	۹۱-۸۶	"	چوتھا	۴۳	۲۰۹-۲۰۵
"	پانچواں	۳۷	۹۷-۹۴	"	پانچواں	۲۰	۲۱۳-۲۱۱
ربیع الثانی	پہلا	۲۹	۱۰۳-۱۰۰	شعبان	پہلا	۲۴	۲۱۸-۲۱۶
"	دوسرا	۳۱	۱۰۸-۱۰۶	"	دوسرا	۲۵	۲۲۳-۲۲۰
"	تیسرا	۲۳	۱۱۳-۱۱۱	"	تیسرا	۴۴	۲۲۹-۲۲۶
"	چوتھا	۴۳	۱۱۷-۱۱۵	"	چوتھا	۴۰	۲۳۶-۲۳۳
"	پانچواں	۳۰	۱۲۳-۱۲۱	"	پانچواں	۳۳	۲۴۲-۲۳۹
	کل اشعار	۶۴۷			کل اشعار	۶۵۵	

مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر	مہینہ کا نام	خطبہ کی ترتیب	تعداد اشعار	حوالہ صفحہ نمبر
رمضان	پہلا	۴۰	۲۳۶-۲۳۹	ذیقعدہ	پہلا	۲۸	۲۹۹-۳۰۲
"	دوسرا	۲۰	۲۵۱-۲۵۳	"	دوسرا	۳۸	۳۰۵-۳۰۹
"	تیسرا	۲۶	۲۵۶-۲۵۸	"	تیسرا	۲۹	۳۱۱-۳۱۴
"	چوتھا	۳۰	۲۶۱-۲۶۳	"	چوتھا	۲۵	۳۱۶-۳۱۸
"	پانچواں	۳۹	۲۶۷-۲۷۰	"	پانچواں	۲۶	۳۲۱-۳۲۳
شوال	پہلا	۲۹	۲۷۳-۲۷۶	ذی الحج	پہلا	۲۳	۳۲۵-۳۲۷
"	دوسرا	۲۴	۲۷۸-۲۸۰	"	دوسرا	۳۱	۳۳۱-۳۳۳
"	تیسرا	۲۹	۲۸۳-۲۸۶	"	تیسرا	۳۸	۳۳۷-۳۴۰
"	چوتھا	۲۹	۲۸۹-۲۹۱	"	چوتھا	۳۷	۳۴۴-۳۴۷
"	پانچواں	۳۰	۲۹۴-۲۹۶	"	پانچواں	۲۹	۳۵۰-۳۵۲
خطبہ عید الفطر	—	۳۶	۳۵۸-۳۶۰	خطبہ عید الضحیٰ	—	۴۲	۳۶۴-۳۶۷
	کل اشعار = ۳۳۲				کل اشعار = ۳۴۶		

مجموعی اشعار ۹۳۷ + ۶۵۵ + ۳۳۲ + ۳۴۶ = ۱۹۷۰ اشعار

مولوی سلطان راجی نے مثنوی کے پیرایہ میں تمام خطبے نظم کیے ہیں جو ایک ہزار نو سو ستر اشعار پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے اشعار کے ربط و تسلسل میں سماجی معنویت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور تلازمۂ خیال میں عرفان و ادراک کے دامن پر ان کی گرفت مضبوط ہے چونکہ یہ طبع زاد نظمیں نہیں بلکہ عربی خطبوں کا ترجمہ ہیں جن میں مترجم نے بڑی حد تک لفظی معنویت سے قریب رہنے کی کوشش کی ہے اس کا جائزہ ذیل کی عبارات و اشعار سے لیا جا سکتا ہے۔

اصل متن: نبیٌ قالَ جابرٌ فی وَ صْفِہِ رَأیتَ النّبیَّ جالِساً وَ القَمرَ فی لیلۃِ کمالِہِ اَتفکّرُ الی النّوریَنِ فاذ الورالنّبیِّ اَجمَل واَحسَنُ۔ معاشِرَ الحاضِرِیْنَ اعلَموَ اَنّ

الدُّنْيَا دَارُ الْاَكْدَارِ وَالْحَزَنِ ۔ وَدَارُ الْمَصَائِبِ وَالْفِتَنِ وَدَارٌ كُسِرَتْ
سِنٌّ غَدَرَتْ بِالْحُسَيْنِ وَالْحَسَنِ بَيْنَمَا اَنْتَ مَرْفَدُ الْحَالِ ۔ خَالِ الْبَالِ
قَوِيُّ الْبَدَنِ ۔[1] (من الخطبة الثالثة لشهر عاشوراء

ترجمہ :

ہیں نبی ایسے کہ جابر نے روایت یوں کیے — وصف میں سردار عالم کے سنواری نیک پے
ایک دن بیٹھے تھے حضرت میں نے دیکھا وقتِ شب — چاند پورا تھا منور اور روشن خوب تب
میں کیا تب فکر یہ نور دونوں دیکھ کر — نور حضرت کا زیادہ نیک تھا اور بیشتر
ہے بشارت حاضرین کو جانئے دنیا کتیں — یہ دغا کی ہے مکاں بھی اور ہے غم کی یقیں
اور جائے مشکلوں کی اور ہے فتنہ کی جائے — دیکھیے حسنین نے دنیا میں کیا سختی اٹھائے
تو ہے اب خوشحال میں اور ہے سبک بار و عزیز — اور بدن تیرا قوی ہے خوب تر اے باتمیز[2]

متن :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اِصْطَفٰى لِجَنَّتِهِ عِبَادًا ۔ وَاَجْتَبٰى لَهُمْ بِقُرْبِهِ مَوَاسِمَ وَاَعْيَادًا
وَاَوْطٰى لَهُمْ عَلٰى فُرُشِ كَرَامَتِهِ مِهَادًا ۔ وَسَقٰى بِهَا قُلُوْبَهُمْ مِنْ سَحَابِ رَحْمَتِهِ
وِدَادًا ۔ فَاحْتَرَقُوْا بِنِيْرَانِ مَحَبَّتِهِ اَكْبَادًا ۔ وَفَارَقُوْا فِيْ طَلَبِ مَوَاصِلَتِهِ اَمْوَالًا
وَاَوْلَادًا ۔ فَسُبْحَانَ مَنْ سَهَّلَ لَهُمُ الطَّرِيْقَ الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ذِهَابًا وَاِيَابًا وَغَفَرَ
لِمَنْ حَجَّهُ اَوْزَارَهُ لِمَا كَابَدَ وَالِرَجَاءِ الثَّوَابِ وَخَوْفَ الْعِقَابِ اَوْدِيَةً وَاَعْقَابًا
حَلُّوْا مِنَ الْحَرَمِ بِسَاحَتِ الْكَرَمِ ۔[3]
(مِنَ الْخُطْبَةِ الثَّالِثَةِ لِشَهْرِ صَفَرِ الْخَيْرِ وَفِيْ ذِكْرِ فِيْهَا قُدُوْمِ الْحَاجِّ)

ترجمہ :

حمد اللہ کو کہ بندوں کو پسند اپنے کیا — واسطے جنت کے اور عیدوں کے موسم میں بجا
اور بندوں کے لیے فرش کرامت کو خدا — یعنی اس مٹی کتیں وہ مثل گہوارہ کیا
اور بندوں کے دلوں کو ابرِ رحمت سے کریم — آب الفت سے پلایا بے شبہ ہے وہ نعیم

---

[1] مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی : ص ۱۵

[2] مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی : محمد سلطان راجی ۔ ص ۱۷-۱۸
[3] ایضاً ص ۴۶

آتشِ الفت سے اس کے سب جلاتے ہیں جگر — وصل کی خواہش میں مال اولاد کو چھوڑے بشر
پاک ذات اس کی کیا ہے سہل بندوں کے لیے — جانے اور آنے میں رہ کعبہ کا مجھو نیک پے
جو زیارت اور حج کی اس کو بخشے ہے خدا — با امید ثواب اور با خوف عقبیٰ جو کیا
پائے شیرینی حرم سے خوب کارِ نیک کر — کیے گنہ بخشا دلوں کو عیب سے سب پاک کرے[1]

متن :

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ذِی الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ ـ وَالْعِزَّۃِ وَالْھَیْبَۃِ وَالْجَبَرُوْتِ ـ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ـ شَھَادَۃَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَکَفَرَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ ـ وَاَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ـ نَبِیٌّ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ مَوْصُوْفٌ ـ وَبِکَمَالِ الْاَوْصَافِ مَنْعُوْتٌ ـ رُوِیَ عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِکٍ وَجَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا ـ قَالَ کَانَ اِبْتِدَاءُ مَرَضِ مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلعم ـ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ فِیْ سَابِعٍ وَعِشْرِیْنَ مِنْ شَھْرِ صَفَرٍ ـ وَاشْتَدَّ بِہِ الْمَرَضُ اِلٰی یَوْمِ الْاِثْنٰی عَشَرَ مِنْ شَھْرِ الرَّبِیْعِ الْاَوَّلِ فَلَمَّا عَلِمَ اَنَّ اَجَلَہٗ قَدْ قَرُبَ وَحَضَرَ اَمَرَ بِلَالًا اَنْ یُنَادِیَ بِالْمُسْلِمِیْنَ فَاجْتَمَعُوْا فِی الْمَسْجِدِ فَقَامَ فِیْھِمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلعم خَطِیْبًا ـ وَوَعَظَھُمْ بِکَلَامٍ ذَرَفَتْ مِنْہُ الْعُیُوْنُ ـ وَوَدَّعَھُمْ وَدَاعَ الْفِرَاقِ ـ فَبَکَتِ النَّاسُ جَمِیْعًا ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الْمِنْبَرِ ـ وَوَجْھُہٗ قَدْ اِصْفَرَّ مِنَ الْمَرَضِ وَتَغَیَّرَ ـ[2]

(الاقتباس من الخطبۃ الرابعہ لشھر ربیع الاوّل وذکر فیھا وفات النبیؐ)

ترجمہ :

حمد اللہ کو کہ صاحب ملک اور ملکوت کا — صاحبِ عزّت وہیبت اور ہے جبروت کا
میں گواہی دوں کہ نہیں ہے کوئی خدا پر ہے خدا — ایک ہے اور نہیں شریک اس کا کوئی اور دوسرا
ہے شہادت اس کی جو ایمان لایا بر خدا — بت پرستی سے کیا انکار جو مردِ صفا
اور گواہی دوں کہ سردار و نبی مولائی کا — ہیں محمد بندے اس کے اور رسولِ رہنما
ہیں نبی ایسے کہ نیک اخلاق سے موصوف ہیں — اور اوصافِ کمالاتوں سے وہ منعوت ہیں

---

[1] مجموعۂ خطبہائے دوازدہ ماہی ـ ص ۴۹

[2] ایضا ـ ص ۸۱ ـ ۸۲

انس بن مالک وجابر سے روایت ہے بجا   ابتدائے مرضِ موت حضرت کا دونوں نے کہا
پیر کے دن ستائیس تاریخ صفر سے دوستو   سختی بیماری کی پھر بڑھنے لگی دل سے سنو
بارویں تاریخ ربیع الاوّل کے بہت سختی ہوئی   جب کیے معلوم حضرت موت اب حاضر ہوئی
حکم فرمائے بلال کو اب منادی کیجیے   سب مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر دیجیے
پس جمع ہوگئے ہیں مسجد میں مسلمانان تمام   تب رسول اللہ کیے مجلس آکر کے قیام
خطبہ بھی پڑھنے لگے اور وعظ بھی کرنے لگے   قطرے آنسو کے مبارک آنکھ سے گرنے لگے
اور کہے سب سے کہ اب تم سے جدا ہوتے ہیں ہم   بس لگے رونے جماعت سب کے سب با درد و غم
بعد پھر منبر سے اترے زرد چہرہ ہوگیا   مرض کی سختی سے اور بھی تھا تغیّر ای فتیٰ[1]

سلطان راجی کی زبان

سلطان راؔجی اڑیسہ کے پہلے صاحب دیوان شاعر شیخ امین اللہ چرخی کے ہمعصر رہے ہیں۔ لیکن دونوں کی زبان میں خاصا فرق رونما ہوتا ہے۔ اگرچہ سلطان راجی شہر کٹک میں تھے جو زبان و ادب کے کلچر کے لحاظ سے مرکزی حیثیت کا حامل تھا لیکن امین اللہ چرخی کٹک سے تقریباً ۲۵ کیلومیٹر دور مضافات کے علاقہ بالوبیسی کشانندپور میں عروسِ سخن کی مشاطگی میں مصروف تھے۔ ان کا طبعی میلان شعروسخن کی طرف تھا۔ ان کی زبان صاف شستہ اور ادبی ہے لیکن راؔجی کے کلام میں شاعرانہ لطافت، نازک خیالی اور فکر کے عنصر کا فقدان واضح ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ مولوی محمد سلطان راؔجی ایک صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے مریدین کا حلقہ وسیع تھا۔ مذہبی تبلیغ اور دینی امور کی طرف وہ نسبتاً زیادہ مائل تھے۔ (اس لیے ان کے کلام کا مطالعہ شاعرانہ تناظر میں کیا نہیں جاسکتا۔) پیشِ نظر "مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" میں انھوں نے عربی خطبوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے اور اس ضمن میں ایک ہزار نو سو ستر اشعار کہے ہیں۔ راؔجی کے کلام سے دکنی اثرات مترشح ہیں۔ جن کا جائزہ تفصیلی طور پر اس طرح لیا جاسکتا ہے۔

---

[1] مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی؛ محمد سلطان راؔجی۔ ص ۸۶ - ۸۷

نئیں بجائے نہیں کا استعمال ۔

اور گواہی دوں کہ نئیں ہے کوئی خدا اس کے سوا　　ایک ہے اور نئیں شریک اس کا کوئی اور دوسرا (ص ۵)
ایسا نئیں پر ان کو دوزخ میں گرا دیویں یقیں　　اس کے ہولِ عظیم پر دیویں گواہی اہلِ دیں (۵۶)
اور نفع نئیں کچھ کریں گے اہلِ وا اولاد و مال　　جب ہوا اس پر چلے گی موت کی اے نیک فال (۱۵۲)

لوگ کی جمع لوگاں :

نیک لوگاں کرتے ہیں تعظیم اس کی بالیقین　　ہے بشارت واسطے اس کے سنو اے اہلِ دیں (۶)

کتیں بجائے کو :

لڑکے سب ہو دیں گے بوڑھے خوف سے اے اہلِ دیں　　دیکھو گے لوگوں کتیں جیسے نشہ میں ہیں یقیں (۳۸)
سال ماہ کو جو نیکی سے گذارا دیندار　　ہے بشارت اسکتیں اور ہے بشارت بے شمار (۶)

قیام بجائے قیامت :

مگر پر اس کے گواہی دیوے گا روزِ قیام　　پڑے کے گمراہی میں نئیں جس نے کیا نیکی کا کام (۶)

خصم کتیں بجائے دشمن کو :

اور کرو راضی خصم کتیں ندامت کے قبل　　اور کہو تم اپنے دل سے اے خداوند فضل (۷)

عذاب کی جمع عذاباں :

آگے تیرے ہیں عذاباں سختیاں بھی بے شمار　　آگ سلگائی ہوئی ہے اور ہے وہ شعلہ دار (۲۵)

گوش بجائے گوشت :

ایسی آتش ہے کہ ہڈیاں گوس سے کردے جدا　　اور گلا دیوے گی دو قدموں کو وہ اے باصفا (۲۵)

سوں بجائے سے / کوں بجائے کو :

ہے شہادت ایسی پہنچاتی ہے دار ثواب کوں　　ظاہر و باطن کے جو اس کو پڑھے اخلاص سوں (۳۰)

کوچ بجائے کوچ :

اب محرّم سے صفر تک نقل تم کو حق کیا　　یہ نشانیاں کوچ کی ہیں اور سفر کی اے فتیٰ (۳۷)

تگ بجائے تک :

خشکی اور دریا میں جو کچھ کہ قلیل و کثیر ہے　　ہے محیط سب پر کہ ذرہ تگ کا بھی وہ خبیر ہے (۳۶)

مغروری بجائے غرور :

فتنہ اور مغروری میں ڈالا ہے تم کو ملک و مال　　جز کفن اعمال کے ساتھی نئیں کوئی نیک فال (۳۸)

دل کی جمع دلاں :

ہوویں گے سب کے دلاں مانند درندوں کے تمام　　انبیاؤں کی طرح ہوویں گے ان کے کلام (۳۸)

تمرے بجائے تمہارے :

واسطے اپنے کرو اختیار تقوے کا لباس　　کی بیاں تمرے لیے یہ نیک مجھو حق شناس (۱۲)

ہمرے بجائے ہمارے :

بخشے سب ہمرے گناہ کو مارے کر کرم سلین　　اپنے رحمت سے سکے ہے گا وہ رحیم الراحمین (۲۰)

لڑکائی بجائے لڑکپن :

وہ متصرف ہے جوانی اور لڑکائی میں کل　　اور بڑھاپے میں بھی حاکم ہے وہی اے اہل دل (۳۰)

چکنا بجائے چکھنا :

کیا نئیں تونے سنا گر عمر ہو تیری زیاد　　موت کا تجھ کو پیالہ چکنا ہے اے خوش نہاد (۵۶)

سپڑنا :

اس پہ زنجیریں ہیں اس میں کافر و فاسق تمام　　جا سپڑ جاویں گے زنجیروں میں سمجھو نیک نام (۵۷)

تمامی بجائے تمام :

آمنہ نے پائے ہیں درجہ سعادت کا کمال　　بت ہوئے اوندھے تمامی سر کو اپنے نیچے ڈال (۴۳)

بادشاہ، حاکم، وزیر، جوان اور مجرم کی جمع بادشاہاں، حاکماں، وزیراں، جواناں، مجرماں :

بادشاہاں کیا ہوئے بابل کے سب اے اہل دین　　حادثے دنیا کے ان کو کر دیے غارت یقین (۲۱)

حاکماں شیروں کے مانند اور وزیراں بھیڑیے　　اور مددگاران کے ہوویں لومڑیوں کے ظہورے (۹۵)

اور جواناں ہوویں گے اس دور کے سب بے ادب　　بوڑھے انکیں نہیں دکھلاویں گے راہِ ادب (۹۵)

دوستاں جب خاک میں جاویں گے اس کو چھوڑ کر　　سخت عذابوں کے ملایک اس کو گھیرے آن کر (۹۶)

اس وقت ڈالیں گے طوقیں گردنوں میں بھائی جان　　کھینچے جاویں گے عذابوں کے طرف سب مجرماں (۹۷)

سلطان راجی نے بڑی حد تک عوامی زبان کو اپنے اشعار میں برتا ہے اور تذکیر و تانیث کے استعمال میں بھی ان کی زبان پر مقامی اثرات حاوی ہیں۔ ان کے مندرجۂ ذیل اشعار سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کئی جگہ انھوں نے تانیث کی جگہ تذکیر کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

بے شبہ ہے وہ شقی جو راہ نیکی سے پھرا　　اور گمراہی کے راہ سے جو چلا ہے وہ برا (۶)

جانیے ڈریے خدا سے اور کیجیے التجا　　اور توبہ کیجیے حق کے طرف قبل از سزا (۶)

اولادِ آدم کے سنوت چلیے گمراہی کے چال　　ارشاد لوگوں کو کرو پاؤ گے راہِ نیک حال (۱۲)

مہتاب المجالس

مہتاب المجالس مولوی محمد سلطان راجی کی منظوم تخلیق ہے۔ بارہ مجلسوں پر مشتمل ۳۶۶ صفحات کی یہ کتاب تقریب عید میلاد النبیؐ میں بارہ دنوں تک پڑھنے کی غرض سے کٹک کے مطبع مظہر النصائح میں ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوئی جس کی تفصیلات کا جائزہ ذیل کے گوشوارہ سے لیا جاسکتا ہے۔

مجلس	تعداد حمد	تعداد سلام	تعداد قصاید	تعداد اشعار	صفحات
مجلس اوّل	۱	۱	۱۳	۴۳۵	۶ - ۳۶
مجلس دوم	۱	۱	۷	۳۳۸	۳۷ - ۶۴
مجلس سوم	۱	۱	۸	۳۶۶	۶۵ - ۹۴
مجلس چہارم	۱	۱	۷	۴۰۲	۹۵ - ۱۲۶
مجلس پنجم	۱	۱	۹	۲۸۵	۱۲۷ - ۱۵۰
مجلس ششم	۱	۱	۱۳	۳۲۳	۱۵۱ - ۱۷۸
مجلس ہفتم	۱	۱	۱۲	۳۲۱	۱۷۹ - ۲۰۶
مجلس ہشتم	۱	۱	۱۱	۳۱۱	۲۰۷ - ۲۳۱
مجلس نہم	۱	۱	۱۵	۲۶۸	۲۳۲ - ۲۵۵
مجلس دہم	۱	۱	۱۲	۳۵۶	۲۵۶ - ۲۸۵
مجلس یازدہم	۱	۱	۱۳	۴۰۶	۲۸۶ - ۳۱۹
مجلس دوازدہم	۱	۱	۱۱	۳۴۲	۳۲۰ - ۳۵۶
الوداع			۱۶ بند	۴۰۲	
مناجات			۳	۳۶	
فاتحہ	۱				۳۵۷
	۱۲	۱۲	۱۳۱	۴۵۸۳	۳۶۶ صفحات

مہتاب المجالس میں کل چار ہزار پانچ سو تراسی اشعار پر مشتمل ایک سو اکتیس قصیدے بارہ مجلسوں میں بارہ حمد اور بارہ سلام کے علاوہ ۱۰۱ بند پر مشتمل الواعیہ مثنوی اور تین مناجاتیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں فاتحہ درج ہے۔ سلطان راجی ایک گوشہ نشین صوفی بزرگ تھے اور ان کی تخلیقات و تالیفات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ مذہبی تصنیفات و تالیفات میں صرف کیا ہے۔ اڑیسہ جیسے دور دراز علاقہ میں مذہبی اور تہذیبی تحریک نے اُردو زبان کے فروغ میں اہم حصہ لیا ہے۔ معاشرتی اعتبار سے زبان کی ترقی و ترویج میں سلطان راجی کی علمی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ "مہتاب المجالس" کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اڑیسہ میں ربیع الاوّل کے موقع پر منثور سیرت پڑھنے کا رواج تھا۔ ایک شخص سیرت کی کسی کتاب کا مطالعہ کرتا اور حاضرینِ مجلس سنا کرتے لیکن ان کی دلچسپی برقرار رہتی نہ تھی اس لیے سلطان راجی نے عام فہم زبان میں روایتوں کو منظوم کرکے پیش کیا۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ:

"اب شوق لوگوں کا قصیدہ خوانی اور سننے پر زیادہ مائل ہے کیونکہ اس میں دو شخص یا تین ہم آواز ہوکر خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اور ہر بیت پر مطلع شعر کو دوسری ایک جماعت تکرار کرتی جاتی ہے۔ اس طور سے پڑھتے ہیں بہت خوبی معلوم ہوتی ہے۔ حضارِ مجلس کی دلکشی کا موجب ایک شخص کے پڑھنے میں یہ خوبی نہیں اس لیے لوگ قصاید نعتِ نبیؐ کے پڑھنے اور سننے میں مائل ہوکر کتاب موصوف کے پڑھنے اور سننے میں سستی کرنے لگے اور اس کے مطالب فیض آگیں سے بے بہرہ اس لیے راجی الی رحمت رحمان عبدہٗ فقیر محمد سلطان عفاءاللہ عنہ وعن والدیہ نے کتاب موصوف کے بارہ مجلس کے جمیع روایات کو قصاید میں لایا تاکہ ماہِ ربیع الاول میں بارہ روز تک بارہ مجلس بطور قصاید کے پڑھا جاوے کیونکہ واحد کے پڑھنے سے جماعت کے پڑھنے میں رونق زیادہ ہے۔"[1]

مہتاب المجالس کی ترتیب میں سلطان راجی کے پیشِ نظر میلاد کی مقبول کتاب مصباح المجالس رہی ہے اور اس میں مندرجہ روایات ہی ان کے قصاید کا مآخذ ہیں۔ راجی نے ہر مجلس کے لیے ایک حمد ایک سلام اور روایات کے مطابق متعدد قصاید کہے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام انھوں نے

---

[1] مہتاب المجالس۔ محمد سلطان راجی۔ مطبوعہ ۱۸۸۳ء (۱۲۸۸ھ)۔ ص ۲

"مہتاب المجالس" رکھا جس کی وجہ تسمیہ دیباچہ میں یوں بیان کرتے ہیں:

"جب روشنی واحد (قاری) کی مانند مصباح کے ہو روشنی جماعت (قاریوں) کی مانند مہتاب کی ہوگی اس لیے اس کا نام "مصباح المجالس" تھا تو اس کا نام "مہتاب المجالس" رکھا اور یہ کتاب بھی جو انجام پائی ماہِ رمضان المبارک کے چودھویں تاریخ پنج شنبہ کے دن میں کہ جس میں مہتاب کو درجۂ کمال حاصل ہے کہ جس کو بدر کہتے ہیں۔ اوس نام کے جہت سے بھی "مہتاب المجالس" نام رکھنا زیبا ہے کیونکہ کمال مہتاب کے دن تیار ہوئی اور جب سن انجام کو کہنے کا خیال کیا تو یہ رباعی برمحل واقع ہوئی:

به انتخاب مصباح المجالس   شدہ تالیف مہتاب المجالس

سن انجام او را ایں گفت راجی   ؎ افزودہ بہ خرشید المجالس (۱۲۸۸ھ)[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ "مہتاب المجالس" کی تکمیل اگرچہ ۱۲۸۸ ہجری میں ہو چکی تھی لیکن اس کی اشاعت پندرہ سال کے بعد ۱۳۰۳ ہجری میں عمل میں آئی۔ مولوی محمد سلطان راجی کے پڑپوتے محمد رفیق ایڈوکیٹ سے معلوم ہوا کہ کٹک میں واقع مطبع مظہر النصائح مولوی سلطان راجی کی ملکیت تھا اور اس میں بیشتر مذہبی کتابیں چھپے اور جناب راجی کی تصنیفات و تالیفات طبع ہوا کرتی تھیں۔ ۱۲۸۷ھ میں مولوی سلطان راجی کی تصوف پر ایک کتاب "معرفت خدا اور رسول" بھی اسی مطبع مظہر النصائح سے شائع ہوئی تھی۔

"مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی" میں ایک بات کھٹکتی ہے کیونکہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے ان کی جمع جب "ہا" کے اضافے سے بنائی جاتی ہے تو اس ہائے مختفی کو لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے جیسے "اندیشہ ہائے دور و دراز" یہی اردو کا چلن ہے لیکن سلطان راجی نے خطبہ کی جمع خطبہا لکھی ہے اور یہاں ہائے مختفی کو حذف کر دیا ہے۔

چونکہ لوگ ترنم سے میلاد پڑھتے تھے اور کچھ لوگ یک آواز ہو کر میلاد پڑھتے تھے جس سے مجمع کی دلچسپی تا آخر قائم رہتی تھی۔ اس عوامی رجحان کے پیش نظر سلطان راجی نے بارہ مجلسیں (میلاد) منظوم کہیں جو ان کا ایک عظیم شعوری کارنامہ ہے اس لیے ان کی نظموں میں بلا کی روانی شگفتگی اور موسیقیت اور آہنگ پیدا ہو گیا جو اس وقت کے شعری رجحانات سے راجی کو الگ کرتا ہے۔

---

[1] مہتاب المجالس۔ ص ۳

نسیم احمد

کلامِ دردؔ کی مختلف اشاعتیں

مشرقی علوم کی ترویج و اشاعت نیز نو وارد انگریز افسروں کی تہذیب و تادیب کی غرض سے ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو کلکتے میں ایک ادارہ فورٹ ولیم کالج کے نام سے قائم کیا گیا۔ تقریباً سات مہینے بعد ۶ر فروری ۱۸۰۱ء کو طلبا کے داخلے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندوستان میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر تک یعنی کالج کے قیام سے قبل شعرا کے کلیات و دواوین اور دوسری کتابیں بالعموم پیشہ ور کاتبوں کے تیار کردہ خطی نسخوں کی صورت میں اشاعت پذیر ہوتی تھیں ۔ یہ کتابیں اولاً تو نقل نویسوں کی لغزشِ قلم یا کم سوادی اور اکثر تصرفاتِ بے جا کی وجہ سے ساقط الاعتبار ہوتی تھیں، ثانیاً علمی و نصابی ضروریات کے لیے پورے طور پر مکتفی نہیں ہو سکتی تھیں، چناں چہ کالج میں تعلیمی سال کے آغاز کے ساتھ ہی طلبا کو درسی کتابیں مہیا کرانے کے لیے کلیات و دواوین اور ان کے انتخابات کے علاوہ دیگر مفید مطلب تصنیفات و تراجم کی اشاعت کا ایک منضبط منصوبہ ترتیب دیا گیا۔ نتیجتاً ایک قلیل مدت ہی میں نثری و شعری کتب کی معتد بہ تعداد چھاپے خانوں میں چھپ کر منصۂ شہود پر آگئی اور اس طرح مشینوں کے ذریعے کتب اردو کی طباعت کی باقاعدہ شروعات ہوئی۔ اسی اشاعتی منصوبے کے تحت خواجہ میر دردؔ کے دو بڑے معاصرین سوداؔ اور میرؔ کا کلام بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ سوداؔ کے کلیات کا انتخاب ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا اور میر کا کلیات ۱۸۱۱ء میں چھپا۔ لیکن تعجب ہے کہ دردؔ جیسے عہد ساز اور "منتخب روزگار" شاعر کے کلام کی اشاعت کی طرف کالج کے اربابِ حل و عقد نے مطلقاً توجہ نہیں کی۔ اسباب کیا تھے، فی الحال اس پر بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

پہلی مرتبہ کلامِ درد کا ایک قابلِ قدر انتخاب مولوی امام بخش صہبائی نے اپنے تذکرہ "انتخاب دواوین" (مطبوعہ ۱۸۴۷ء) میں شامل کیا۔ اس انتخاب میں کل گیارہ شعرا کا نمونۂ کلام ان کے اجمالی تعارف کے ساتھ درج ہے۔ اصلاً یہ کتاب "طلبا اور مبتدیان" کی

ضروریات کی تکمیل کی غرض سے مرتب کی گئی تھی۔ کلام کے انتخاب اور شعرا کے حالات کے بیان میں کسی اعلیٰ معیارِ نقد یا ذوقِ تحقیق کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ انتخاب مذکور کے انداز پر ۱۸۴۷ء میں جب مولوی کریم الدین نے اپنا تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" ترتیب کیا تو انھوں نے بھی دردؔ کے کلام کا ایک قابلِ لحاظ انتخاب بہ بطور نمونہ درج کیا۔ اول الذکر میں دردؔ کے اشعار کی تعداد چار سو ننانوے (۴۹۹) ہے اور ثانی الذکر میں تقریباً تین سو۔ یہ دونوں انتخابات کلامِ دردؔ کی قدیم ترین مطبوعہ صورتیں ہیں۔

خواجہ میر دردؔ کا اردو دیوان بھی ۱۸۴۷ء میں مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر کے حسبِ فرمائش پنڈت دھرم نرائن کی نگرانی میں چھاپہ خانہ "مطبع العلوم" مدرسۂ دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کی ترتیب و تصحیح کا کام اشپرنگر ہی کے ایما پر مولوی امام بخش صہبائی نے انجام دیا تھا اور اب تک کی معلومات کے مطابق دردؔ کے اردو دیوان کا یہی قدیم ترین مطبوعہ ایڈیشن ہے۔

کلامِ درد (اردو) دوسری مرتبہ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں ان کے فارسی دیوان کے ساتھ کلیاتِ درد کے نام سے مطبع کبیری، قصبہ سہسرام، بہار سے چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ حسبِ قاعدۂ قدیم حوض اور حاشیے دونوں میں اشعار مندرج ہیں۔ حوض میں فارسی متن ہے اور حاشیے پر (ص ۴۲-۱۰۴ تک) اردو کلام کو جگہ دی گئی ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے فارسی اور اردو کلام کا یہ ایڈیشن اُس وقت کی کتابت و طباعت کا اچھا نمونہ ہے اور کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور ایک ڈاکٹر شمس بدایونی کے ذاتی ذخیرے میں موجود ہے۔

نسخۂ صہبائی اور نسخۂ کبیری کی اشاعتوں کے بعد دیوانِ درد کا تیسرا ایڈیشن مطبع محمدی لکھنؤ میں چھپ کر ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔ منشی الطاف حسین کی فرمائش پر جناب محمد یعقوب نے کئی قلمی نسخوں کی مدد سے "ہزار جاں فشانی" کے ساتھ اسے حسنِ ترتیب بخشا۔ کل اڑتالیس صفحات پر مشتمل اس ایڈیشن کے حوض اور حاشیے دونوں میں اشعار درج ہیں۔ آخر میں خاتمۃ الطبع کی عبارتوں سے قبل مصنف کا احوال تذکرۂ محسن سے مع قطعہ سالِ وفاتِ درد از ستاتھ سنگھ بیدار شامل کتاب کیا گیا ہے۔

۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء میں دیوانِ درد کا ایک اور ایڈیشن دہلی کے معروف مطبع مصطفائی

میں چھپ کر اشاعت پذیر ہوا۔ یہ نسخہ میر محمد حسین تحسین مرحوم کا مرتب کیا ہوا ہے اور کم یاب ہے۔ بقول داؤدی صاحب اس کا صرف ایک نسخہ مجلس ترقی ادب لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے (مقدمۂ دیوانِ درد، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مطبوعہ ۱۹۶۲ء)

۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں مجبس[1] پریس دہلی میں دیوانِ درد طبع ہوا تھا۔ ناشر کا دعوا ہے کہ اس نے "متعدد قلمی و مطبوعہ نسخوں کی مدد سے اس کے متن کی تصحیح کی ہے"۔ یہ کم یاب ہے۔ جناب رشید حسن خاں کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبعِ ثانی ہے اور پریس مذکور نے اس کو پہلی مرتبہ ۱۲۷۱ھ میں شائع کیا تھا۔

لکھنؤ کے مطبع اسدی میں درد کے اردو کلام کا ایک ایڈیشن "دیوانِ ہندی خواجہ میر درد" کے نام سے چھپا تھا۔ یہ ایڈیشن بھی کم یاب ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ جامعہ پنجاب، لاہور اور ایک انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے۔ اس پر سالِ طباعت کا اندراج نہیں ہے۔

مطبع نول کشور (واقع لکھنؤ اور کان پور) میں دیوانِ درد متعدد بار چھپا۔ ماہ دسمبر ۱۸۸۱ء/۱۲۹۹ھ کا مطبوعہ ایک نسخہ میری دست رس میں ہے۔ یہ لکھنؤ سے دوسری بار شائع ہوا ہے۔ ایک اور ایڈیشن ماہ جون ۱۸۹۱ء کا مطبوعہ ہے جو کان پور سے چوتھی بار چھپا ہے۔ مشفق خواجہ نے ۱۹۰۱ء کے ایک اور نول کشوری ایڈیشن کی نشان دہی کی ہے۔ یہ پانچویں بار شائع ہوا ہے۔ یہ تمام ایڈیشن معیار و مقدار کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ خاتمۃ الطبع کی عبارتیں بھی ماہ و سال کے فرق کے ساتھ قریب قریب ایک جیسی ہیں۔ ان عبارات سے قبل نسخۂ محمدی کی پیروی میں تذکرۂ محسن سے مصنف کا احوال، قطعۂ سالِ وفات از سناتھ سنگھ بیدار کے ساتھ ہر ایڈیشن میں نقل کیا گیا ہے۔ استخراجِ سنہ کے سلسلے میں پہلی غلطی ہر بار دہرائی گئی ہے۔ یعنی ۱۱۹۹ھ کی بجائے ۱۱۹۵ھ لکھا گیا ہے۔

دہلی کے مطبع "افتخار" میں دیوانِ درد کا ایک ایڈیشن منشی محمد ابراہیم کی نگرانی میں،

---

[1] پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، جناب مشفق خواجہ اور جناب الف۔ د۔ نسیم نے بالترتیب مقدمۂ دیوانِ درد، ص ۲۷، "جائزۂ مخطوطات"، ص ۸۰۳ اور "کتابیات" ص ۱۱ میں "مجبس" کی جگہ "مجلس" لکھا ہے جو درست نہیں۔

دہلی ہی کے تاجر کتب نرائن داس جنگلی مل کی فرمائش پر ۱۸۹۲ء میں چھپا تھا۔ آخر میں نول کشوری ایڈیشنوں کی طرح احوالِ مصنف ماخوذ تذکرہ سراپا سخن مولفہ محسن علی محسن درج ہے۔ یہ ایڈیشن کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ مجلسِ ترقی ادب لاہور میں محفوظ ہے۔ (بحوالہ مقدمۂ دیوانِ درد مرتبہ خلیل الرحمٰن داودی)

مطبع انصاری، دہلی سے دیوانِ درد کا ایک ایڈیشن نواب صدّیق حسن خاں (بھوپال) کے صاحب زادے نواب سید نور الحسن خاں کی فرمائش پر ۱۳۱۰ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دیوان کی ابتدا میں کوئی مقدمہ نہیں ہے البتہ خاتمے پر سید محمد نذیر حسین صاحب محدّث دہلوی کے عزیز جناب مولوی میر شاہجہان صاحب متخلص بہ کامل کی بارہ سطری نثر اور پندرہ اشعار پر مشتمل ایک تقریظ ضرور شامل ہے، جس سے دیوان کے چھاپے جانے کی غرض و غایت معلوم ہو جاتی ہے۔ تقریظ کے خاتمے پر انطباع دیوان کے دو تاریخی قطعات بھی مندرج ہیں۔ ان میں پہلا قطعہ تقریظ نگار کا ہے اور دوسرے کے مصنف محمد سردار خاں کیفی دہلوی ہیں۔

مطبع کراچی سعادت علی خاں میں دیوانِ درد کا ایک دیدہ زیب نسخہ خاصے اہتمام کے ساتھ چھاپا گیا تھا۔ یہ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اس کے بارے میں مندرجہ ذیل اطلاع بہم پہنچائی ہے:

"دیوانِ درد کا ایک اور قدیم نسخہ بڑے اہتمام کے ساتھ مطبع کراچی سے شائع کیا گیا تھا۔ سرورق جو تزئین کاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے، ان کلمات سے آراستہ ہے ... 'دیوانِ خواجہ میر درؔد مطبع کراچی سعادت علی خاں طبع شد'۔ دوسرے اور تیسرے صفحے کو بھی مزین اور منقش بنایا گیا ہے۔ اس میں متن کے خاتمے پر تذکرہ بہارِ بے خزاں سے مصنف کا حال نقل کیا گیا ہے۔ اس کی ایک جلد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے" ("تاریخ طباعت متن" از ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی جنوری ۱۹۷۳ء ص ۵۸ بحوالہ جائزہ مخطوطات اردو جلد اوّل ص ۴۸۴)

دیوانِ درد کا ایک خاص ایڈیشن سر راس مسعود کی تحریک پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ مقدمہ نگار کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایڈیشن کیف و کم میں نسخۂ مصطفائی مطبوعہ

۱۸۵۵ء کے مطابق ہے۔ شروانی صاحب کی فرمائش پر سید معین الدین نے اسے کئی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ یہی ایڈیشن فرہنگ اور شرح دیوان کے اضافے کے ساتھ پریس مذکور میں ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۹ء میں بھی چھپا۔

۱۹۲۹ء میں مطبع نول کشور نے دیوانِ درد کا ایک خاص ایڈیشن مولانا عبدالباری آسی کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ آسی مرحوم نے اسے ایک قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے تیار کیا تھا۔ ان مطبوعہ نسخوں میں ایک نسخہ شاہی پریس سلطان المطابع' لکھنؤ کا چھپا ہوا ہے اور دوسرا نظامی پریس بدایوں کا۔ مقدمے کے آخر میں ۱۱ر فروری ۱۹۲۸ء کا اندراج یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کا عمل اس کے سنہ اشاعت ۱۹۲۹ء سے تقریباً ایک سال قبل پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

محبوب المطابع پریس دہلی میں دیوان درد کی ایک شرح ۱۹۴۱ء میں چھپی تھی۔ اس کے شارح اور مرتب خواجہ محمد شفیع دہلوی ہیں۔ یہ کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ عامۂ پنجاب' لاہور میں موجود ہے۔ (مقدمہ دیوانِ درد مرتبہ داؤدی ص ۱۰۸)

۱۹۴۱ء ہی میں شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب، کشمیری بازار کی فرمائش پر شیخ ظفر محمد پرنٹر پبلشر نے دیوانِ درد کا ایک ایڈیشن برانچ کوآپریٹو کیپیل پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ' حیدر آباد (بھارت) میں محفوظ ہے۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی میرے پیش نظر ہے۔

۱۹۴۴ء میں حسرت موہانی نے کان پور سے انتخاب درد شائع کیا تھا جو "انتخاب سخن" جلد چہارم کے جزو دوم میں شامل ہے۔ یہ صرف چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ (جائزہ مخطوطات ۴۸۵)

شیخ مبارک علی تاجرانِ کتب' لاہور نے متعدد بار دیوانِ درد شائع کیا ہے۔ طبع چہارم شائع شدہ ۱۹۴۴ء کا ایک نسخہ کتب خانہ جامعہ پنجاب' لاہور میں محفوظ ہے۔

لاہور کے ایک اور تاجر کتب ایم فرمان علی اینڈ سنز نے دیوانِ درد کا ایک ایڈیشن شائع کیا تھا۔ (خواجہ میر درد ــ کتابیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ص ۱۲)۔ لاہور ہی کے تعلیمی پریس میں بھی دیوانِ درد ۱۹۵۰ء میں طبع ہوا تھا (ایضاً)

۱۹۵۱ء میں دیوانِ درد مرتبہ آسی کو پاکستان کے دو بڑے اہم مراکز اردو مرکز لاہور اور اردو اکادمی کراچی نے علاحدہ علاحدہ شائع کیا۔

جناب مشفق خواجہ نے مقدمۂ دیوانِ درد از عبدالباری آسی، مطبوعہ ۱۹۵۱ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ "دیوانِ درد سلطان المطابع، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا" (جائزۂ مخطوطات ۴۹۲) پاکستان کے ایک اسکالر الف۔ د۔ نسیم نے خواجہ صاحب کی اسی تحریر کی بنیاد پر اسے ایک مستقل ایڈیشن شمار کیا ہے (کتابیات ص ۱۱) لیکن یہ وہی ایڈیشن ہے جو "حسب الحکم .... سلطان المطابع" ۱۲۷۱ھ میں مطبع محمدی میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دراصل یہ اشتباہ سرورق کی درج ذیل عبارتوں سے پیدا ہوا ہے۔

"بحسب الحکم مہر ذیل مطبع کثیر النافع المسمّٰی بسلطان المطابع باہتمام .....

..... در کلاں کوٹھی مطبع محمدی بحسن سعی محمد یعقوب رونق طبع یافت ۔"

(سرورق نسخہ مطبع محمدی ۱۲۷۱ھ)

دیوانِ درد کا ایک ایڈیشن محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپ کر اردو مرکز ۱۱۱۷ حویلی حسام الدین بلیماران دہلی سے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں نہ مقدمہ ہے نہ عرضِ مرتب اور نہ ہی صاحبِ مطبع یا ناشر کی طرف سے ترتیب و تصحیحِ متن کے متعلق کسی قسم کا دعوا شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اصلاً یہ چھوٹی کتابی سائز میں خالص تجارتی نوعیت کا ایک معمولی ایڈیشن ہے۔ متن نسخۂ آسی کے مطابق ہے چوں کہ کتابت جداگانہ ہوئی ہے لہٰذا سہوِ کاتب کے نتیجے میں بعض مزید غلطیاں اس میں راہ پا گئی ہیں اور متن نسخۂ منقول عنہ سے چند مقامات پر مختلف ہو گیا ہے۔

"اردو کا کلاسیکی ادب" کے اشاعتی پروگرام کے تحت ریڈنگ پرنٹنگ پریس (لاہور) میں چھپ کر دیوانِ درد کا ایک نیا ایڈیشن پہلی بار فروری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ مرتب جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس کے شروع میں بڑی محنت اور جگر کاوی سے ایک سو اکیاسی صفحوں کا ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے۔ مرتب نے جتنی کھکھیڑ مصنف کے حالات یکجا کرنے میں اٹھائی ہے اور جس قدر وقت عزیز مقدمہ نگاری کی نذر کیا ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی دیوان کی تیاری پر صرف کیا ہوتا نیز دستیاب قلمی و مطبوعہ نسخوں کی مدد سے متن درست کر لیا ہوتا تو یقیناً ان کا یہ کارنامہ اہلِ علم کی نظروں میں مستحسن قرار پاتا۔ انھوں نے سہل انگاری اور آسان پسندی کے پیشِ نظر نسخۂ نظامی اور نسخۂ آسی سے پورا متن عموماً بنا کسی غور و فکر کے اخذ کر لیا ہے۔ چناں چہ وہ ساری غلطیاں اس دیوان میں بھی در آئی

ہیں جو اس کے اساسی نسخوں میں موجود ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا مرتبہ "دیوانِ خواجہ میر درد" شائع کیا ہے۔ یہ اشاعت ثانی ہے۔ نسخے کا تیسرا اور آخری ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپ کر مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہی نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ فاضل مرتب نے اس کتاب کو اپنے برادر بزرگ جناب حبیب احمد صدیقی کے نام منسوب کیا ہے۔ دیوان کی ترتیب میں تین قلمی اور چار مطبوعہ نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔ مرتب نے اپنے اساسی نسخے کے ترقیمے کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں مخطوطے کی کتابت کا سنہ ۱۲۲۲ھ مرقوم ہے۔ لیکن اصلاً یہ نسخہ ۱۲۲۲ھ کے تحریر شدہ کسی دیوان کو سامنے رکھ کر نقل کیا گیا ہے۔ ترقیمے کے درج ذیل آخری دو فقروں (جنھیں دانستہ یا نادانستہ چھوڑ دیا گیا ہے) سے یہی مترشح ہوتا ہے۔

"نقل مطابق اصل است" "مقابلہ شدہ"

یہ قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کی ملکیت ہے۔ اسی لائبریری میں مخطوطہ نمبر ۲۵۵ کے تحت دیوانِ درد مرقومہ ۱۲۱۳ھ موجود ہے جو مرتب کے اساسی نسخے سے زیادہ بہتر، معتبر اور قدیم تر ہے۔ یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ اس نسخے سے استفادہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔ جب کہ مرتب کو اصولاً اسی نسخے کو بنیاد بنانا چاہیے تھا۔

۱۹۷۱ء ہی میں مکتبہ جامعہ دہلی نے دیوانِ درد مرتب کرا کر شائع کیا۔ اس کی ترتیب کے فرائض جناب رشید حسن خاں نے انجام دیے تھے۔ اور اسے اس دعوے کے ساتھ شائع کیا گیا تھا کہ اس میں "مقدور بھر صحتِ متن کا اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے"۔ (تعارف دیوانِ درد، مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۲)

رشید حسن خاں ایک ژرف بین محقق اور تدوینِ متن کے رمز شناس ہیں۔ ان کے نام اور منقولہ بالا دعوے کے ساتھ شائع شدہ دیوان کو تمام طرح کے متنی اسقام و اغلاط سے پاک ہونا چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ کلامِ درد کا یہی ایڈیشن عام طور پر بازار میں ملتا ہے اور اسی کو طلبا و اساتذہ درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ اس کا طبع ثانی ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔

خواجہ میر درد کی زندگی کا واحد قلمی دیوان (مکتوبہ ۱۱۹۴ھ) ڈاکٹر فضل امام استاد شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی ملکیت ہے۔ اسے مالکِ مخطوطہ ہی نے "دیوانِ درد کا نقشِ

اوّل" کے نام سے مرتب کرکے ۱۹۷۹ء میں آپکار پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کردیا ہے۔
ڈاکٹر فضل امام نے اپنے مقدمے میں مخطوطے کو جوں کا توں یعنی املا کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے، چھاپ دینے کا دعوا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے الفاظ یہ ہیں:

"میں نے اس نسخے میں یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ (مخطوطے) کا املا جوں کا توں پیش کیا جائے اس لیے جدید املا سے کام نہیں لیا گیا ہے۔" (مقدمہ ص ۱۴)

کسی مخطوطے کو جوں کا توں چھاپ دینے کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ اس کا عکس شائع کردیا جائے اور مقدّمے میں اختصار کے ساتھ اس کے کوائف بیان کردیے جائیں۔ اس طرح اوّل تو مخطوطہ محفوظ ہوجاتا ہے۔ دوسرے اس کی پوری کیفیت سے اہلِ علم کو آگاہی ہوجاتی ہے۔ کتابت کراکر شائع کرنے کی صورت میں کبھی کبھی محض ناقل یا کاتب کی عجلت یا بے توجہی یا مخطوطے کو صحیح طور پر نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے متن اکثر مقامات پر مشکوک ہوجاتا ہے اس نوع کی غلطیاں اس نسخے میں کثرت سے در آئی ہیں۔

سطور بالا میں مذکور تقریباً تمام ایڈیشن غیر سائنسی انداز پر اور اکثر تجارتی مقاصد کے تحت چھاپے گئے ہیں اور متن و املا کی مختلف الاقسام غلطیوں سے پُر بھی ہیں۔ ایسی صورت میں طلبا و اساتذہ کی ضروریات نیز ادبی و لسانی اہمیت کے پیشِ نظر کلامِ دردؔ کو جدید اصولِ تحقیق کی روشنی میں از سرِ نو مدوّن کیا جانا از حد ضروری ہے۔

کمال احمد صدیقی

فراق گورکھپوری کے ساتھ ایک یادگار ملاقات

نجی صحبتوں میں فراق گورکھپوری کی خوش بیانی اور حاضر جوابی کے جوہر کھلتے تھے، اور عالم سرور میں تو ذہن اور زبان کی دھار کچھ اور تیز ہوجاتی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں مرکزی وزارتِ صحت نے خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر ایک کُل ہند مشاعرہ سرینگر (کشمیر) میں کیا تھا۔ فراق صاحب بھی اس میں شرکت کرنے کے لیے گئے تھے۔ اگلے روز وہ کمال احمد صدیقی سے ملنے ریڈیو کشمیر گئے۔ رسمی خاطر تواضع کے بعد کمال انھیں اور اپنے کچھ رفقاءِ کار کو لے کر اسٹوڈیوز گئے، اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر محفل جم گئی۔ جب اسٹوڈیوز میں فلک (لال بتی) آئی تو فراق صاحب چونکے اور بولے۔ کیا غضب کرتے ہو۔ کمال نے گفتگو کا آغاز کر دیا...

کمال احمد صدیقی : فراق صاحب، آپ صرف غزل کے شاعر نہیں ہیں۔ لیکن کچھ ایسا ہے کہ اس عہد میں آپ اور غزل ہم معنی ہو گئے ہیں۔ غزل کی وسعتوں اور اس کی تنگ دامانیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فراق گورکھپوری : دنیا بھر میں مشہور اور مقبول ترین اصنافِ سخن کی شاید کچھ عمر ہوا کرتی ہے۔ مثلاً انگلستان میں سانیٹ کو لیجیے۔ کیا کیا پھول کھلائے ہیں شیکسپیر یا ورڈس ورتھ نے؟ لیکن ایک ڈھائی سو برس کے اندر معلوم

ہوتا ہے سانیٹ اپنے امکانات کھو چکا ہے۔ ہیروئک کپولیٹ HEROIC COUPLET میں ڈرائی ڈن یا پوپ کا نام کون بھول سکتا ہے۔ مگر اب کوئی کہتا نہیں۔ تو غزل نے، کمال صاحب اس سے لمبی زندگی پائی ہے۔ اگر ہم ایران اور ہندوستان' دونوں کو لیں، تو جتنی لمبی زندگی غزل نے پائی ہے' اتنی کسی زبان کی کسی صنف سخن نے نہیں پائی۔ چار سو برس پائی ہے یہ زندگی۔ تو میں کہوں گا کہ جیسے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ سب سے سہل طریقہ شاعری کا، اور سب سے مشکل طریقہ شاعری کا غزل ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ یا تو کوئی بہت بڑی ایسی ہستی جنم لے ہمارے یہاں جس کا ہم آج تصور نہیں کر سکتے، اور وہ غزل کو ان بلندیوں سے بھی زیادہ بلند لے جائے جہاں تک وہ پہنچی ہے۔ یا پھر وہ دوسرے انداز کی شاعری کرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم اور آپ انتظار کریں کہ غزل کو کوئی نیا موڑ یا غزل میں کوئی نئی حقیقت' نیا انداز، نیا وجدان کوئی پیدا کر سکے گا کہ نہیں؛ مگر غزل میں نہ پیدا ہوا تو نظم میں آنے دیجیے۔ آزاد نظم میں آنے دیجیے۔ میں یہاں تک کہہ دوں گا کہ جو جدید شاعری ہوئی ہے، جو آپ نے کی ہے، کون جانے اسی میں کوئی جنم لے لے۔ ایک بات آخر میں کہہ دوں کہ تمام فنونِ لطیفہ... ان ہی میں شاعری بھی شامل ہے، یہ سب مذہب کے بطن سے پیدا ہوئے ہر فن کی ماں، اس کی کوکھ مذہب تھی۔ میں مذہب کے معنی یہ مذہب اور وہ مذہب نہیں لیتا۔ جیسے میں یہ کہوں گا کہ بھوک ہندو یا مسلم نہیں ہوتی۔ بھوک، بھوک ہوتی ہے۔ تو مذہب مذہب ہوتا ہے۔ وہ ہندو یا مسلم یا کرسچن نہیں ہوتا۔ تو مذہب جو ہے وہ ایک INSTINCT جبلت ہے۔ لیکن میں اتفاق سے اور نہایت اپنے ساتھ بے دردی کر کے اس کا قائل اپنے آپ کو کر لیتا ہوں کہ اس INSTINCT کو مارا جا سکتا ہے۔

اس نام پر کہ انسان کا بھلا ہو۔ یہ غلط ہے۔ چنانچہ میں یہ کہوں گا، بغیر یہ بتائے ہوئے کہ میں مذہب کس چیز کو سمجھتا ہوں۔ بہرحال اس میں خدا کا نام نہیں آئے گا۔

کمال : آپ کا مطلب عقیدے اور یقین سے ہے؟

فراق : نہیں کمال صاحب، نہیں۔

کمال : پھر کس چیز سے ہے؟

فراق : وجدان کے اُس عالم سے ہے، جس کے لیے دوسرے لفظ کے بغیر ہم مذہب ہی کہتے ہیں۔ میرے نزدیک عقیدت کا مذہب دشمن ہے۔ ایمان کا مذہب دشمن ہے۔ ہم کو ٹھنڈک لگ رہی ہے، تو کیا میرا ایمان ہے کہ مجھے ٹھنڈک لگ رہی ہے؟ براہ راست داخلی احساس، جس میں کوئی دخل ایمان یا تعلیم کو نہ ہو، وہ مذہب ہے۔ اب (وقفہ) بہر حال آپ نے بہت مشکل سوال کر دیا ہے حضور!

کمال : نہیں فراق صاحب، جب آپ نے یہ بات کی ہے تو ہم سمجھنا چاہیں گے کہ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کا ادراک آپ کے نزدیک مذہب ہے؟

فراق : ہزاروں ادراک ہوں گے۔

کمال : ہزاروں؟

فراق : جی ہاں کمال صاحب، ہزاروں۔ اور ان میں آپس میں تصادم ہو گا... دیکھو بھئی مشکل سوال ہے یہ۔ بھئی یہ ریڈیو ہے۔

کمال : جی ہاں۔ اسی لیے ہم چاہیں گے کہ ہمارے سامعین کے لیے آپ اپنے نظریے کی وضاحت کریں۔

فراق : میں یہ گذارش کروں گا کہ زندگی سے بغیر استدلال کے محبت۔ اور ایسی محبت کہ جس کے سامنے استدلال سر جھکائے، وہ مذہب ہے۔

کمال : مثلاً سقراط کے کچھ نظریات تھے۔ جب اس سے کہا گیا تو اس نے زہر پی لیا۔ اس نے مذہب کے لیے زہر پیا اور اس زمانے کا جو

اسٹیبلشمنٹ تھا، تو اس نے اپنے مذہب کے لیے زہر پلوایا۔

فراق : اس نے تو اپنے آدرش کے مطابق زہر پیا۔

کمال : ان دونوں میں سے آپ کس کو مذہب سمجھتے ہیں؟

فراق : آپ تو بڑی زیادتی میرے ساتھ کر رہے ہیں۔ بھلا ایسے مشکل سوال کا جواب آپ چاہتے ہیں؟ (وقفہ) میں ایک منٹ میں بتاؤں گا یہ... ایک تو رائے سے بہت دشمنی ہے مذہب کو۔ اختلافِ رائے ... اگر کسی چیز سے نفرت ہے مذہب کو تو اس کا نام ہے رائے۔

کمال : اور رائے سے اختلاف؟

فراق : اور رائے کی تجدید۔ رائے کی شدید شکل ہے ایمان اور اعتقاد، مذہب دشمن ایمان ہے۔ مجھ کو بھوک لگی ہے۔ یہ میرا ایمان نہیں کہ بھوک لگی ہے۔ مجھے لگی ہے۔ اس کا نام ہے مذہب اچھا چھوڑیے۔ بہت نازک سوال ہے بھئی۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بھئی یہ جو غزل آپ فرما رہے تھے کہ اس کا کیا مستقبل ہے؟ اس کی وسعتیں کیا ہیں؟ تجزیہ کیا ہے؟

کمال : جی ہاں۔

فراق : تو اگر ہم کو سائنس نے، سیاست نے، اور دیگر تحریکات نے، ہم سے چھین لیے وہ مرحوم احساسات، جن سے اچھی غزل ممکن ہے، تو غزل کا مستقبل کوئی نہیں ہے۔ میں ایک شعر سناؤں گا۔

کمال : ارشاد۔

فراق : شعر میرا نہیں ہے، میر مہدی مجروح کا شعر ہے:

اب اَن بَن ہو گئی ہے باغباں سے
مجھے نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

کمال : واہ۔ نکلا ہی سمجھو، واہ۔

فراق : اگر اس جذبے سے یہ شعر کہا گیا ہو کہ ہم باغباں کا گلا گھونٹ کے گلستاں پہ قبضہ کریں گے، تو اچھی شاعری نہیں ہو سکتی۔ میری بات ایک بہت بڑے ادیب سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا روزی اور

اور مجبوری کے احساس کے بغیر بڑا ادب پیدا نہیں ہوتا۔

کمال : بشرطیکہ کے یہ جذبہ بھی ہو کہ مجبوری کے جو اسباب ہیں، ان کو بھی ختم کیا جائے۔

فراق : وہ تو ہونا چاہیے۔ وہ تو بالکل ہے۔ بہت صحیح ہے۔ بالکل درست۔ ہم دنیا کو بہتر بنائیں گے۔ لیکن کوئی نہ کوئی چیز ایسی ہے کہ جو ہم کو فتح کرنے پر بھی مجبور انسان ہونے کا احساس کراتی ہے۔ قادر مطلق ہستی خدا نہیں ہو سکتی۔

کمال : انجیلِ مقدس میں آیا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل وشبیہہ میں پیدا کیا۔

فراق : ہاں۔

کمال : ایک نظریہ یہ بھی کہ انسان نے خدا کو اپنی شکل وشبیہہ میں پیدا کیا۔

فراق : جی۔

کمال : تو مطلب یہ ہے کہ بیک وقت آپ دونوں باتوں کو مانتے ہیں؟ جب آپ کہتے ہیں کہ وہ مجبور ہے، کیونکہ وہ تو دراصل انسان کی مجبوری ہو جاتی ہے۔

فراق : انسان ہی مجبور نہیں ہے۔ آخری حقیقت بھی مجبور ہے۔ مگر یہ بڑی گہری بات ہے۔ یہ تو سمجھیے کہ آپ مابعد الطبیعات میں ہم کو گھسیٹ رہے ہیں۔ چھوڑیے میں آپ سے گذارش صرف یہ کروں گا کہ جو آپ نے سوال کیا ہے۔

کمال : جی۔

فراق : میں کہتا ہوں، انسان کی عزت کبھی کبھی کر لینا بہت اچھا ہے لیکن ...

کمال : ہمیشہ اس کی عزت کرتے رہیں تو اور بھی زیادہ اچھا ہے۔

فراق : اس سے بالکل اختلاف نہیں۔ لیکن میں دوسری بات کہہ رہا تھا۔

کمال : جی، فرمائیے۔

فراق : صرف خدا نے اپنی امیج میں انسان کو بنایا۔

کمال: جی۔

فراق: واقعہ یہ ہے کہ ایک چیز میں آدمی کو بڑی دقت ہوئی ہے۔ وہ زمین کو دیکھتا تھا، پہاڑوں کو دیکھتا تھا، ہوا کو دیکھتا تھا، آگ کو دیکھتا تھا، موت کو دیکھتا تھا۔ اسی کو اس نے کل وجود نہیں سمجھا اور ایک خدا کی طرف گیا۔ اتفاق سے سوچا۔ فلاسفی جب آتی ہے تو انھوں نے کہا کہ اس کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ یہ قائم بالذات اور واجب الوجود چیز ہے۔ مادّہ اور اس کی ایک شکل ہے، چلتا پھرتا آدمی۔ تو خدا، ہم جسے کہتے ہیں وہ ہمارے اندر بہترین وجود کا ایک خواب ہے۔ ہم اس کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ میری ہڈیوں سے جو یہ آواز آتی ہے یار، جب ہم سمجھ رہے ہیں، اس سے کوئی بہتر صورت بھی ہے۔ اس کو خدا ماننا تو ٹھیک ہے۔

کمال: فراق صاحب، ہم بھی اس فہرست میں ہیں جو انتظار کر رہے ہیں آپ کے کلام کا۔ یہ حضرات بھی آئے ہیں۔

فراق: اچھا اچھا۔ دیکھیے اپنی شرارت۔ یہ دوسری شرارت۔

(کمال نے قہقہہ لگایا)

فراق: (قہقہہ) تو سنا دوں کیا؟

کمال: ارشاد۔

فراق: تعجب کیا، جو تیرے سامنے ہم چپ سے رہتے ہیں
ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

کمال: واہ واہ، بہت خوب۔

فراق: آپ نے غزل کے متعلّق مجھ کو بہت دق کیا ہے آج۔ تو میں ایک شعر سناؤں گا آپ کو۔

کمال: ضرور سنائیے۔

فراق: کہتا ہوں۔

فنِ سخن کو ازل سے تلاش تھی جن کی
ترے سکوت میں پائی گئیں وہی باتیں
(ٹرانسکرپٹ میں سے داد کا حصہ حذف کیا گیا)
دیکھ آئے آج یادوں کا نگر
ہر طرف پرچھائیاں، پرچھائیاں

عرض کرتا ہوں:

جلوۂ جاناں۔ یہ سولولکی ہے۔ خود کلامی

جلوۂ جاناں ، جلوۂ جاناں
اے شبِ ہجراں، اے شبِ ہجراں
تو ہی اوّل تو ہی آخر
اے غمِ ہجراں ، اے غمِ ہجراں
ہائے گنہ گارانِ محبت
نادم نادم ، نازاں نازاں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا
کون ہے صبحِ ازل سے خراماں
عمرِ فراق نے یوں ہی بسر کی
کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں

کمال : فراق صاحب، رباعی کا آہنگ الگ ہے۔ اس آہنگ میں کچھ غزلیں بھی ہیں۔ رباعی میں چار چار مصرعے ہوتے ہیں، لیکن رباعی کو غزل سے بہت الگ نہیں سمجھا جاتا۔

فراق : یو آر رائٹ۔ بالکل صحیح ہے۔ اسپرٹ اس کی وہی ہے۔

کمال : کچھ تازہ رباعیاں عنایت ہوں۔

فراق : ادھر کم کہی ہیں، مگر غالباً فرسودہ نہ معلوم ہوں گی کہتا ہوں:

ہر شئے پہ تیرگی کی یہ چھاؤں گھنی
میخانۂ شب میں نوشں و پیمانہ زنی

چھلکی چھلکی صبوحی موجِ نسیم
فطرت کی وہ پچھلی رات اعضا شکنی

خلقت کو سنوار دے، عبادت کیا ہے
دنیا کا شباب آئے، جنت کیا ہے
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ
سرشارِ مجاز ہو، حقیقت کیا ہے

میرے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ہاسپٹل میں رات کو سوچا کہ ایک رات، دو رات اور جی رہا ہوں۔ تو مذہبی وغیرہ تو غالباً میں نہیں ہوں۔

کمال : غالباً بہت اچھا کہا ہے۔ (قہقہہ)

فراق : نہیں ہوں تو کیا بات ہے۔ اور ہوں بھی تو کیا بات ہے۔ مگر اتفاق سے لٹریچر ذرا ایک آدرش کی طرف جھک جاتا ہے۔ مذہب معنے آدرشیت۔ اور کچھ نہیں۔ اچھی آدرشیت ہو۔ تھوڑا تھوڑا مارکس کو بھی کہوں گا کہ تھا۔

کمال : مذہبی تھا؟

فراق : بالکل۔

قیصر قلندر : آپ پھر کمال صاحب کو اُکسا رہے ہیں، ایک اور سوال کرنے کے لیے۔

فراق : نہیں بھئی، سوال نہیں۔ اچھا سنیے۔ لیکن آپ بولنے نہیں دیں گے اس کو (قہقہے) ہاں بھئی۔ خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے۔

ہاں تو جب میں مر رہا تھا۔

کمال : یوں کہیے کہ جب میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا... (قہقہہ)

فراق : ہاں کچھ ایسا ہی ہے... تو :

اے بانیِ کائنات ، مجھ میں آجا
اے رازِ صفات و ذات ، مجھ میں آجا
سوتا سنسار... ہاسپٹل میں رات کے گیارہ بج گئے تھے

اے بانیِ کائنات مجھ میں آجا
اے رازِ صفات وذات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جگمگاتے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

اب مگر ہمیشہ شکایت رہے گی۔ بہت مشکل سوال تھے۔ اتنے مشکل سوال مت کیا کرو۔

کمال : نہیں فراق صاحب، سوال جو تھے وہ تو ذہن ہی میں رہ گئے۔ میں نے تو کوئی سوال ہی نہیں کیا۔ آپ جو گفتگو کر رہے تھے، جہاں سمجھ میں بات نہیں آئی وضاحت چاہی آپ سے۔ آپ تشریف لائے، اس کے لیے شکریہ۔ میری طرف سے بھی اور سامعین کی طرف سے بھی۔

فراق: اتنا مشکل سوال بھی نہ کیا کرو۔ پرچہ بہت مشکل تھا۔

(قہقہے)

(غیر مطبوعہ)

تاریخِ ادبِ اُردو

(۱۷۰۰ء تک)

(جلد اوّل تا پنجم)

(مع اضافہ)

پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین

☆ عہد اولیں کے تمام مہیا مواد کا تحقیق شدہ نچوڑ۔

☆ محققین، اساتذہ، اہل علم و قلم، طلبہ اور عام اُردو داں حضرات کے لیے ایک بہترین تحفہ۔

☆ لائبریری اور دیگر اداروں کی اہم ضرورت۔

☆ یہ تاریخ نہیں دستاویز ہے۔

جلد اوّل	صفحات	462	قیمت	170	روپے
جلد دوم	صفحات	527	قیمت	170	روپے
جلد سوم	صفحات	467	قیمت	170	روپے
جلد چہارم	صفحات	431	قیمت	170	روپے
جلد پنجم	صفحات	443	قیمت	170	روپے

(مع اضافہ)

جو خریدار یا کتب فروش یکم جولائی 99 سے پیشتر یہ سیٹ خرید چکے ہیں کونسل سے مفت ضمیمہ طلب کر سکتے ہیں جو جلد پنجم کے تیرھویں باب پر مشتمل ہے۔

براہِ راست طلب کرنے پر طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس کو خصوصی رعایت

صدر دفتر : قومی اُردو کونسل، ویسٹ بلاک۔ ا، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110 006

فون : 6179657 ,6103938 ,6103381 فیکس : 6108159

حیدر آباد شاخ : 5-4-435/20 گرین ہاؤس، اسٹیشن روڈ، نام پلی اسٹیشن روڈ، حیدر آباد۔500002

فہرستِ کتب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مطبوعات

ادبیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
1.	آدمی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	۷۳/=
2.	ابوالکلام آزاد۔ شخصیت، سیاست پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	۲۱/=
3.	ابوالکلام آزاد۔ ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر رشید الدین خاں	۵۸/=
4.	اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	۱۲۰/=
5.	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (تیسری طباعت)	احتشام حسین	۷۰/=
6.	اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (عہد مرزا و میر تک)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	۲۲/=
7.	اردو کے ادبی معرکے (انشاء سے غالب تک) ترمیم و اضافے کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	۳۰/=
8.	اردو کی کہانی	احتشام حسین	۲۱/=
9.	اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	۳۰/=
10.	اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	۹۸/=
11.	اردو ڈراموں کا انتخاب	پروفیسر محمد حسن	۱۵۰/=
12.	اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۲۰۰/=
13.	اردو زبان کی تدریس	معین الدین	۴۰/=
14.	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	ڈاکٹر غلام ایم لعل زاد / ڈاکٹر شعیب اعظمی	۸۰/=
15.	ارنیسٹ ہیمنگوے حیات و فن کا تنقیدی مطالعہ (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	۸/۳۰

.16	امریکی ادب کا مختصر جائزہ (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	۵۲/=
.17	انتخاب غزلیات میر	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	۱۵/=
.18	انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	۹/=
.19	انشاء کاتر کی روزنامچہ	سیّد محمد نعیم الدین	۴/۵۰
.20	انیس کے سلام	علی جواد زیدی	۲۰/=
.21	انیس کے مرثیے اوّل (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	۳۶/=
.22	انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	۴۰/=
.23	برنارڈ شا	عبدالمغنی	۳۵/=
.24	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	۱۸/=
.25	بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	۵۸/=
.26	پشکن (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری	۲۰/=
.27	پھول بن	ابن نشاطی	۵۲/=
.28	تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ / پروفیسر نذیر احمد	۱۲/=
.29	تالستائے	ڈاکٹر محمد یٰسین	۴۶/=
.30	تامل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	۱۳۵/=
.31	جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	۱۸۰/=
.32	جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن	ظفر محمود	۳۸/=
.33	چکبست	رام لال نابھوی	۱۸/=
.34	چخوف (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری	۱۰/=
.35	حیات جاوید (چوتھی طباعت)	الطاف حسین حالی	۱۶۷/=
.36	خسرو شناسی (تیسری طباعت)	ظ۔ انصاری / ابوالفیض سحر	۸۰/=
.37	دانتے	زیڈ۔ اے۔ عثمانی	۸/۲۵
.38	دستنبو (غالب)	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (مترجم)	۱۲/=
.39	درس بلاغت (تیسری طباعت)	ترقی اردو بیورو	۴۷/=
.40	قدیم اردو نظم (۱)	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	۴۰/=
.41	دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	۴۲/=
.42	دکنی ہندو اور اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	۱۵/۵۰
.43	دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیدہ جعفر	۴۵/=
.44	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	۱۷/=
.45	دیوان آبرو	پروفیسر محمد حسن	۲۵/=
.46	دیوان حسرت عظیم آبادی	ڈاکٹر اسماء سعیدی	۱۰۰/=

47.	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفاحیات اور کارنامے	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	۱۲/=
48.	ڈاکٹر ذاکر حسین	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم (مرتبہ)	۷۰/=
49.	ذوق و جستجو	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۳۴/=
50.	رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	۶۲/=
51.	رباعیات انیس	علی جواد زیدی (مرتب)	۸۵/=
52.	زندگانی بے نظیر	سید محمد عبد الغفور شہباز / سید محمد حسنین	۱۹/=
53.	سب رس کے حروف (صرفی مطالعہ)	آصفہ بیگم	۹/۵۰
54.	سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	۷۷/=
55.	شعریات (تیسری طباعت)	ارسطو/شمس الرحمٰن فاروقی	۶۲/=
56.	شعر شور انگیز (اوّل)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۵۰/=
57.	شعر شور انگیز (دوم)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۳۰/=
58.	شعر شور انگیز (سوم)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۵۰/=
59.	شعر شور انگیز (چہارم)	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۷۰/=
60.	صحیفۂ خوش نویساں	مولوی احترام الدین احمد شاغل	۱۲/=
61.	عربی ادب کی تاریخ (۱) (تیسری طباعت)	پروفیسر عبد الحلیم ندوی	۷۷/=
62.	عربی ادب کی تاریخ (۲)	پروفیسر عبد الحلیم ندوی	۸۴/=
63.	عربی ادب کی تاریخ (۳)	پروفیسر عبد الحلیم ندوی	۵۵/=
64.	غزل اور غزل کی تحریک (دوسری طباعت)	ڈاکٹر اختر انصاری	۱۸/=
65.	فسانۂ آزاد (جلد اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۱۰۰/=
66.	فسانۂ آزاد (جلد دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۶۵/=
67.	فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۶۷/۵۰
68.	فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۶۷/۵۰
69.	فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۵۰/=
70.	فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	۵۰/=
71.	فکر و تحقیق (۱)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
72.	فکر و تحقیق (۲)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
73.	فکر و تحقیق (۳)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
74.	فکر و تحقیق (۴)	قومی اردو کونسل	۱۵/=
75.	فکر و تحقیق (۵)	قومی اردو کونسل	۲۰/=
76.	فکر و تحقیق (۶)	قومی اردو کونسل	۲۰/=
77.	فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون ۱۹۹۷	قومی اردو کونسل	۳۰/=

78.	فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر ۱۹۹۷	قومی اردو کونسل	۳۵/=
79.	فکر و تحقیق (۹) جنوری تا جون ۱۹۹۸	قومی اردو کونسل	۵۰/=
80.	فکر و تحقیق (۱۰) جولائی تا ستمبر ۱۹۹۸	قومی اردو کونسل	۴۰/=
81.	فکر و تحقیق (۱۱) اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸	قومی اردو کونسل	۴۰/=
82.	فکر و تحقیق (۱۲) جنوری تا مارچ ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۴۰/=
83.	فکر و تحقیق (۱۳) اپریل تا جون ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۲۵/=
84.	فکر و تحقیق (۱۴) جولائی تا ستمبر ۱۹۹۹	قومی اردو کونسل	۲۵/=
85.	فیودر دستوئیفسکی	ظ۔ انصاری	۵۲/=
86.	قومی تہذیب کا مسئلہ	پروفیسر سید عابد حسین	۵۴/=
87.	قطب مشتری	اسد اللہ وجہی / ڈاکٹر حمیرہ جلیلی	۴۸/=
88.	قلم کا مزدور پریم چند	مدن گوپال	۲۰/=
89.	کاشف الحقائق	سید امداد امام اثر / پروفیسر وہاب اشرفی	۱۴۵/=
90.	کائنات جلیل	علی احمد جلیلی	۸۰/=
91.	کلیات ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۳۴/=
92.	کلیات سراج	سراج اورنگ آبادی	۱۳۵/=
93.	کلیات سراج (ڈی لکس)	سراج اورنگ آبادی	۴۸/=
94.	کلیات سودا (حصہ اول)	پروفیسر محمد حسن	۴۸/=
95.	کلیات سودا (حصہ دوم)	پروفیسر محمد حسن	۱۳/=
96.	کلیات عیش	ڈاکٹر حبیبہ بانو	۸۰/=
97.	کلیات فانی (طبع ثانی)	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۶۳/=
98.	کلیات قلی قطب شاہ	پروفیسر سیدہ جعفر	۱۵۷/=
99.	کلیات میر	ظل عباس عباسی	زیر طبع
100.	لمعات بصیرت	رگھوناتھ کھمئی	۴۰/=
101.	مثنوی بہرام و گل اندام	ابن سعید اختر	۶۶/=
102.	مجموعہ نغز (تذکرہ شعرائے اردو)	قدرت اللہ قاسم	۵۰/=
103.	مسدود راہیں	زاہدہ زیدی	۱۲۶/=
104.	مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات	پروفیسر محمد حسن	۲۸/=
105.	مقالات مسعود	پروفیسر مسعود حسین خاں	۱۸/۵۰
106.	مولیر	پروفیسر ثریا حسین	۱۵/=

107.	نالاڈیار (کلاسیکی تامل اشلوکوں کا مجموعہ)	غازی حمید اللہ خاں	۴/۷۵
108.	واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات	کوکب قدر سجاد علی میرزا	۹۷/=
109.	وضاحتی کتابیات (جلد اول ۱۹۷۶ء)	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	۷۴/=
110.	وضاحتی کتابیات (جلد دوم) ۱۹۷۷ء-۱۹۷۸ء	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	۷۴/=
111.	وضاحتی کتابیات (جلد سوم)	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	۱۴۵/=

تاریخ۔ جغرافیہ۔ سیاست۔ ثقافت

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
112.	ہندوستانی مسلمان	پروفیسر محمد مجیب / سید محمد مہدی	۲۵۸/=
113.	ہندی ادب کے بھگتی کال میں مسلم ثقافت کے اثرات (دوسری طباعت)	سید اسد علی / ڈاکٹر ماجد حامد	۲۲/=
114.	یاد بود غالب	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۲۱/=
115.	آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے / کشور سلطان	۶۰/=
116.	آزادی	جان اسٹورٹ مل / سعید انصاری	۵۴/=
117.	آزاد ہندوستان (حصہ دوم) (تیسری طباعت)	ایس۔ ایل۔ کھنہ	۲/=
118.	ابتدائی علم شہریت	ایس، این، چٹوپادھیائے / شریف الحسن نقوی	۴/۵۵
119.	ارتھ شاستر	آچاریہ چانکیہ / شان الحق	۱۰۹/=
120.	اسلامی تہذیب و تمدن	عماد الحسن آزاد فاروقی	۱۴/=
121.	اسلامی سماج	ریوبن لیوی / حشیر الحق	۶۰/=
122.	اکبر سے اورنگ زیب تک (طبع ثانی)	ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی	۹۴/=
123.	البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	۱۱/=
124.	انقلاب ۱۸۵۷ء (تیسری طباعت)	مرتب: پی۔ سی۔ جوشی	۷۵/=
125.	انقلاب فرانس	جے۔ ایم۔ تھامپسن / ڈاکٹر محمود حسین	۱۴۰/=
126.	اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	محمد اطہر علی / امین الدین	۲۸/=
127.	بادشاہ	میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین	۱۴/=

128.	برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	=/۳۶
129.	تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی	=/۱۰
130.	تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	۱۰/۵۰
131.	تاریخ تحریک آزادئ ہند (دوسری طباعت) (حصہ اول)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	=/۱۰۳
132.	تاریخ تحریک آزادئ ہند (حصہ سوم)	ڈاکٹر تاراچند / قاضی محمد عدیل عباسی	=/۷۵
133.	تاریخ تعلیم ہند	جے۔ پی۔ پٹنائک / سید نور اللہ	=/۱۱۱
134.	تاریخ تمدن ہند	پروفیسر محمد مجیب	=/۱۱
135.	تاریخ ٹیپو سلطان	محب الحسن / حامد اللہ افسر	=/۱۲۰
136.	تاریخ جہانگیر (دوسری طباعت)	بنی پرشاد / رحم علی الہاشمی	زیر طبع
137.	تاریخ شاہجہاں (دوسری طباعت)	بناری پرشاد سکسینہ / سید اعجاز حسین	زیر طبع
138.	تاریخ فلسفہ سیاسیات (طبع ثانی)	پروفیسر محمد مجیب	=/۹۷
139.	تحریک آزادئ ہند	ظہور محمد خاں	۲/۲۵
140.	تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	=/۶۰
141.	تذکرہ دربار حیدر آباد	رتن راج سکسینہ	زیر طبع
142.	جامع تاریخ ہند	محمد حبیب / خلیق احمد نظامی	زیر طبع
143.	جدید سیاسی فکر	سید انوار الحق حقی / ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	۱۴/۲۵
144.	جدید ہندوستان کے معمار (دوسری طباعت)	آئی۔ سی۔ ایچ۔ آر / ڈاکٹر قیام الدین احمد	=/۱۴
145.	جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد	ایس۔ ڈبلیو وولرج / انیس احمد صدیقی	=/۱۹
146.	جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	=/۴۷
147.	جنوبی ہند کی تاریخ زمانہ ما قبل تاریخ سے وجے نگر کے زوال تک	آئی، سی، ایچ، آر / آر، کے، بھٹناگر	=/۱۱۴
148.	چولا راجگان (طبع ثانی)	کے، ایل، نیل کنٹھ شاستری	=/۲۰۹
149.	حکومت اور آئین (چھٹی طباعت)	مترجم ڈاکٹر قیصر شمیم	=/۲
150.	حیدر آباد کے روزناموں کی ادبی خدمات	سید ممتاز مہدی	=/۹۲
151.	حیدر علی (دوسری طباعت)	نریندر کرشن سنہا / اقتدار حسین صدیقی	=/۷۲
152.	خلجی خاندان	کے، ایس، لال / محمد یسین مظہر صدیقی	=/۸۸
153.	دکن کی قدیم تاریخ	پروفیسر یزدانی	=/۴۹
154.	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خاں شیروانی / رحم علی الہاشمی	=/۸۸

155.	رنجیت سنگھ	نریندر کرشن سنہا/ کیلاش چندر چودھری	۹/۲۵
156.	ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی ۱۸۰۰تا۱۹۰۰	سید محمد جواد رضوی	=/۲۰
157.	سفرنامہ فرہنگ سیر طالبی فی بلاد افرنجی	مرزا ابوطالب اصفہانی/ ثروت علی	=/۳۲
158.	سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ	محمد حبیب/ بیگم افسر عمر سلیم خاں	=/۱۳
159.	سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت (طبع ثانی)	ابن حسن، آئی اے ظلّی	=/۸۶
160.	سوویت یونین کا سیاسی نظام	ظفر امام	=/۷۴
161.	شہیدانِ آزادی (حصہ اوّل)	پی۔این۔چوپڑا/ بھگوت سنگھ	=/۱۱۳
162.	شہیدانِ آزادی (حصہ دوم)	پی۔این۔چوپڑا/ سید تفضل حسین	=/۱۰۰
163.	شیر شاہ سوری اور اس کا عہد	الکارنجن قانون گو/ رام آسرا شرما	=/۱۳۵
164.	صوبائی خود مختاری کی ابتدا	ایس گومر/ بشیشور پرشاد	۱۲/۵۰
165.	ظہیر الدین محمد بابر (دوسری طباعت)	ایل، ایف، رش بروک ولیمز/ رفعت بلگرامی	=/۱۳
166.	علی وردی اور اس کا عہد	کالی کنکر دتا/ عبدالاحد خاں خلیل	=/۸۶
167.	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین	=/۱۱۰
168.	قدیم ہندوستان کی تاریخ	راما شنکر ترپاٹھی	=/۱۱۴
169.	قدیم ہندوستان میں تعلیم	اے۔ایس۔ التکر/ ابویوسف	=/۳۵
170.	قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں	ڈی۔ڈی۔ کوسمبی/ بال مکند عرش ملسیانی	=/۷۳
171.	قدیم ہندوستان میں شودر (طبع ثانی)	رام سرن شرما/ جمال الدین محمد	=/۸۲
172.	مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا/ علی جواد زیدی	=/۶۰
173.	مغل دربار کی گروہ بندیاں اور سیاست (دوسری طباعت)	ڈاکٹر ستیش چندر/ ڈاکٹر قاسم صدیقی	=/۲۲
174.	مغل ہندستان کا طریقہ زراعت	عرفان حبیب/ جمال محمد صدیقی	=/۱۱۹
175.	مغلوں کا نظام مالگزاری ۱۷۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک (طبع ثانی)	نعمان احمد صدیقی/ ایس۔ نبی ہودی	=/۵۸
176.	مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ایس۔این۔ ترپاٹھی/ ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	=/۳۷
177.	مراد آباد۔ تاریخ اور صنعت	تاباں نقوی	=/۱۲
178.	مسیر طالبی (سفرنامہ)	ابوطالب اصفہانی/ ثروت علی	=/۳۲

.179	منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ	شجاع الدین فاروقی	۴۵/=
.180	ناوابستگی	پروفیسر رشید الدین خاں / ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ مہدی	۳۷/=
.181	نظام حکومت اور سماجی زندگی	کے اے نیل کنٹھ شاستری	۱۱۸/=
.182	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	سر مور ٹیمر / زبیر رضوی	۴۵/=
.183	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت اور سماجی زندگی	ٹی۔ وی۔ مہالنگم / نیل کنٹھ شاستری	۴۱/=
.184	ہمایوں نامہ	گلبدن بیگم / عثمان حیدر مرزا	۱۱/=
.185	ہندوستان سرزمین اور عوام	تارائی گپتا / ایس۔ کے۔ سنگھ	۲/=
.186	ہندوستان کا شاندار ماضی	اے۔ ایل۔ باشم / غلام سمنانی	۱۳۵/=
.187	ہندوستان کے دور وسطی کے مورخین	پروفیسر محب الحسن / سرور علی ہاشمی	۴۵/=
.188	ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	نیل پرساد / محمد محمود فیض	۱۲/۲۵
.189	ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	ڈاکٹر رفیق زکریا	۴۶/=
.190	ہندستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	ایچ۔ این۔ سنہا / پروفیسر محمد سلیم قدوائی	۹۵/=
.191	ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی۔ سی۔ سرکار / ملیحہ مسیح الزماں	۴۹/=
.192	ہندوستانی مصوری ایک خاکہ	انیس فاروقی	۱۳۰/=
.193	ہندوستانی مصوری (عہد مغلیہ میں)	پرسی براون / عبید الحق	۱۵۸/=
.194	ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں (دوسری طباعت)	کنور محمد اشرف / قمر الدین	۳۰/=
.195	ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس	حبیب اللہ / مسعود الحسن	۲۵/=
.196	یوروپ کے عظیم سیاسی مفکرین	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	۱۸۹/=

تذکرۂ مخطوطات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
.197	تذکرۂ مخطوطات (حصہ اوّل)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
.198	تذکرۂ مخطوطات (حصہ دوم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
.199	تذکرۂ مخطوطات (حصہ سوم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
.200	تذکرۂ مخطوطات (حصہ چہارم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=
.201	تذکرۂ مخطوطات (حصہ پنجم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	۲۳/=

لسانیات، لغات، قواعد اور
کتب خانہ داری

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
202	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اول)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۳۰۰/=
203	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ دوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۳۵۰/=
204	اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ سوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	۳۵۰/=
205	آہنگ اور عروض	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۱۸/=
206	املانامہ	مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ	۹/=
207	اردو تصویری لغت	شیلا کماری / ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	۳۰/=
208	اردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خاں	۳۴/=
209	اردو افعال	سونیا چے نیکوا	۲۴/=
210	اردو املا	رشید حسن خاں	۱۳۵/=
211	اسکول لائبریری	سید حسین رضا رضوی	۲۰/=
212	جامع انگریزی اردو لغت A-C (حصہ اول)	کلیم الدین احمد	۴۰۰/=
213	جامع انگریزی اردو لغت D-G (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
214	جامع انگریزی اردو لغت H-N (حصہ سوم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
215	جامع انگریزی اردو لغت (O-Q) (حصہ چہارم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
216	جامع انگریزی اردو لغت R-S (حصہ پنجم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
217	جامع انگریزی اردو لغت T-Z (حصہ ششم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۶۰۰/=
218	توضیحی لسانیات	ایچ اے گلیسن / عتیق احمد صدیقی	۳۳/=
219	زبان و قواعد	رشید حسن خاں	زیر طبع
220	صحت الفاظ	سید بدر الحسن	۳۳/=
221	صوتیات فونیمیات	پروفیسر اقتدار حسین	۲۴/=
222	عام لسانیات	پروفیسر گیان چند جین	۷۵/=
223	عشری درجہ بندی	سلیس ڈیوی / سید محمود حسن قیصر	۱۶۷/=
224	عہدۂ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	کے۔ سی۔ ہیریسن / امہ جبیں اختر	۲۴/=
225	فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین احمد	۲۷/=
226	فرہنگ آصفیہ (۱)	مولوی سید احمد دہلوی	۲۵۰/=
227	فرہنگ آصفیہ (۲)	مولوی سید احمد دہلوی	۲۵۰/=

228.	فرہنگ آصفیہ (۳)	مولوی سید احمد دہلوی	۲۵۰/=
229.	فرہنگ اصطلاحات انسانیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	زیرِ طبع
230.	فرہنگ اصطلاحات تاریخ و سیاسیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۲۴/=
231.	فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ	قومی اردو کونسل	۳۱/=
232.	فرہنگ اصطلاحات حیوانیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۱۲/=
233.	فرہنگ اصطلاحات ریاضیات (طبع ثانی)	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۲۱/=
234.	فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، نفسیات اور تعلیم	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۳۰/=
235.	فرہنگ اصطلاحات کیمیا	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۸/=
236.	فرہنگ اصطلاحات لسانیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۲۰/=
237.	فرہنگ اصطلاحات معاشیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۱۰/=
238.	فرہنگ اصطلاحات نباتیات	اردو بیورو (انگریزی اردو)	۱۵/=
239.	فرہنگ سیاسیات	محمد محمود فیض / حسن علی جعفری	۳۸/=
240.	کتاب کی تاریخ	شایاں قدوائی	۱۳/۵۰
241.	کتب خانہ داری ایک تعارف	شہاب الدین انصاری	۲۴/=
242.	لسانیات کیا ہے؟	ڈاکٹر ڈیوڈ کرسٹل / ڈاکٹر نصیر احمد خان	۱۱/=
243.	لسانی مطالعے ترمیم واضافے کے ساتھ (تیسرا ایڈیشن)	پروفیسر گیان چند جین	۲۲/=
244.	لغت ابجد شماری (جلد اوّل، حصہ اوّل)	سید احمد (سڈنی)	۸۵/=
245.	لغت ابجد شماری (جلد اوّل، حصہ دوم)	سید احمد (سڈنی)	۱۲۹/=
246.	لغت ابجد شماری (جلد دوم، حصہ اوّل)	سید احمد (سڈنی)	۱۲۹/=
247.	لغت ابجد شماری (جلد دوم، حصہ دوم)	سید احمد (سڈنی)	۱۲۹/=
248.	مبادی کتابیات	شہاب الدین انصاری / کرشن کمار	۲۲/=
249.	مختصر اردو لغت	ترقی اردو بیورو	۲۶۰/=
250.	مفتاح التقویم (طبع ثانی)	حبیب الرحمان خاں صابری	۱۵۵/=
251.	نور اللغات (حصہ اوّل)	مولوی نور الحسن نیر	۳۰۰/=
252.	نور اللغات (حصہ دوم)	مولوی نور الحسن نیر	۲۵۰/=
253.	نور اللغات (حصہ سوم)	مولوی نور الحسن نیر	۲۳۰/=
254.	نور اللغات (حصہ چہارم)	مولوی نور الحسن نیر	۳۱۵/=
255.	نئی اردو قواعد	عصمت جاوید	۱۵/=
256.	وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	۱۸/=
257.	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چڑجی / پروفیسر عتیق احمد صدیقی	۱۳/۵۰
258.	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	رولکر / علی ابن الحسین زیدی	۷/۲۵
259.	ہندوستان کے زمانہ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانہ	بمل کمار دت / تاج عالم عابدی	۱۰/۲۵

فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
260.	ابتدائی سماجیات	ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی	۶/۲۵
261.	ابتدائی نفسیات	سید محمد محسن / محمد رضوان احمد خاں	۶۱/=
262.	ابنارمل نفسیات	الفریم روزن / ذکیہ مشہدی	۷۲/=
263.	ادبیات شناسی	پروفیسر محمد حسن	۱۲/۵۰
264.	انسان اپنی تلاش میں	رولو مے / زاہدہ زیدی	۳۰/=
265.	اردو زبان کی تدریس (تیسری طباعت)	معین الدین	۴۰/=
266.	اشارات تعلیم	آسٹن / نورالحسن	۴۵/=
267.	اصول تعلیم (دوسری طباعت)	خواجہ غلام السیدین	۲۴/=
268.	اصول تعلیم اور عمل تعلیم	ڈی، ایس گارڈن / خلیل الرحمٰن اور سیفی پریمی	۶۹/=
269.	پتنجلی کا فلسفہ یوگ	مترجم کرشن کمار پاٹھک	۱۲/=
270.	تاریخ فلسفہ اسلام (طبع ثانی)	ٹ۔ ج۔ دوبوئر / سید عابد حسین	۵۰/=
271.	تاریخ فلسفہ سیاست	پروفیسر مجیب	۹۷/=
272.	تاریخ ہندی فلسفہ	ایس۔ این۔ داس گپتا / رائے شیو موہن لال ماتھر	۳۰/=
273.	تحلیل نفسی کا اجمالی خاکہ	سگمنڈ فرائڈ / ظفر احمد صدیقی	۱۰/۵۰
274.	تدریس تاریخ	خلیل الرب	۱۸/=
275.	تدریس جغرافیہ	محمد ضیاء الدین علوی	۲۰/=
276.	تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سلامت اللہ	۶۵/=
277.	تعلیمی تشکیل نو کے مسائل	خواجہ غلام السیدین / ایم۔ ابوبکر	۱۲/۷۵
278.	تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری	عبدالمغنی مدہوش	۱۳/۷۵
279.	تعلیم سماج اور کلچر (دوسری طباعت)	اے، کے، سی، اٹاوے / ڈاکٹر اختر انصاری	۶۱/=
280.	تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورینس / ڈاکٹر سلامت اللہ	۴۷/=
281.	تعلیم کی نفسیاتی اساس	عبداللہ ولی بخش قادری	۶۵/=
282.	تعلیم کا عمل	جیروم۔ ایس برو / معین الدین	۵/۵۰
283.	تعلیم کے مقاصد اور وسائل	تھیوڈر برامیلڈ / خلیل الرب	۱۸/=

284.	تعلیم (ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں)	ایس۔ ایم۔ جعفر/ سعید انصاری	۸/۲۵
285.	ثانوی مدارس میں تدریس	نیلسن، ایل، بوسنگ / مسرور علی، اختر ہاشمی	۶۰/=
286.	جدید ابتدائی منطق (طبع ثانی)	ایل سوسن اسٹیبنگ / ڈاکٹر سلطان علی شیدا	۵۷/=
287.	جدید ہندوستان میں ذات پات	ایم، این سرینواس / شہباز حسین	۸/۲۵
288.	جدید دنیا میں تعلیم	نیاز احمد اعظمی	۲۰/=
289.	جواہر پارۂ اوراک / شنکر آچاریہ	شنکر آچاریہ / کرشن کمار پاٹھک	۸/=
290.	زمان و مکان	وزیر حسن عابدی	۱۵/=
291.	سماج اور تعلیم	محمد عبدالقادر عمادی	۵/۷۵
292.	سماجی فلسفہ کا خاکہ	جے۔ ایس۔ میکنیس زے	۲۲/=
293.	شخصیت کے نظریات	ساجدہ زیدی	۹۲/=
294.	شریمد بھگوت گیتا	مترجم: حسن الدین احمد	۳۸/=
295.	علم مدنیت کی تدریس	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۱/=
296.	علم طبیعیات اور جدید طریقۂ تعلیم	رضیہ شیخ نظام الدین	۲۱/=
297.	فلسفیانہ تجربہ ایک تعارف (طبع ثانی)	جان ہاسپرس/ ایس، اے، شیدا	۱۲۰/=
298.	فلسفہ کے بنیادی مسائل	اے، سی، ایونگ / میر ولی الدین	۷۳/=
299.	قدیم ہندی فلسفہ	رائے شیو موہن لال ماتھر	۸۲/=
300.	کامرس کیسے پڑھائیں	محمد شریف خاں	۱۴/۵۰
301.	کپل کا فلسفہ سانکھیہ	(مترجم) کرشن پاٹھک	۳۰/=
302.	معاشیات کیسے پڑھائیں	ریاض شاکر خاں	۱۴/=
303.	مدرسۂ عمل	اڈولف فیریر / شیخ غلام حسین	۹/۷۵
304.	نسل اور نسلی امتیاز	عبدالقادر عمادی	۸/۵۰
305.	نفسیات جنوں (طبع ثانی)	برنارڈ ہارٹ / عبید زمان	۳۸/=
306.	ہمارا قدیم سماج	سید یحیٰ حسن نقوی	۵۳/=
307.	ہندو فلسفہ مذہب اور نظام معاشرت	سید حامد حسین	۹/=
308.	ہندوستانی گاؤں	شیاما چرن دوبے / عبدالقادر عمادی	۱۷/=
309.	ہندوستان میں عورت کی حیثیت	آئی۔ سی۔ آر۔ / صغرا مہدی	۶۲/=
310.	ہندوستانی سماج ساخت اور تبدیلی	ضیاء الدین احمد	۳۸/=
311.	ہندی فلسفہ کے عام اصول	شیو موہن لال ماتھر	۱۸/=
312.	ارضیات کے بنیادی تصورات	وائی ابروچیف / پروفیسر ماجد حسین	۲۲/=
313.	انسانی ارتقاء	ایم، آر، ساہنی / احسان اللہ	۷۰/=

معاشیات، تجارت

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
314.	اجارہ	این، اے، جی، رابسن / ایم، اے، گیلانی	۱۷/۵۰
315.	اجرتیں	موریس ڈاب / عبد الرشید	۱۰/۵۰
316.	اصول معاشیات	رضیہ نظامی	۱۰/=
317.	بین الاقوامی معاشیات	چارلس پی کنڈل برجر / لیاقت علی خاں	۳۵/=
318.	تجارت بین الاقوامی و مبادلات خارجہ	محمد باقر زیدی	۱۶/=
319.	دفتری انتظامیہ	بشمبر / پروفیسر محمد سعید	۱۲/=
320.	شماریات اور ان کا استعمال	ایل۔ اے۔ باؤکنس / انجم الحسن	۱۵/۷۵
321.	کامرس برائے سکنڈری اسکول	سیتارام ورما / زین العابدین	۴/۵۰
322.	کھاتہ نویسی و کھاتہ داری (طبع ثانی)	کے۔ ایچ۔ فاروقی	۷۶/=
323.	معاشیات کے بنیادی اصول	سراج الحسن	۸۴/=
324.	ہندوستان اور مشرقی وسطیٰ کے تجارتی تعلقات	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	۲۲/=
325.	ہندوستان کا صنعتی ارتقاء	ڈی۔ آر۔ گیڈگل / ایم۔ صدیقی	۱۳/=
326.	ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ اوّل) ۱۷۵۷ء تا ۱۸۳۷ء	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۱۸/۷۵
327.	ہندوستانی معاشیات	ایس کے بھٹناگر / محمد خلیل یامین	۵/۳۰
328.	[ہندوس]تانی معاشیات	برج کشور / این۔ کے۔ بھٹناگر	۵/۳۰
329.	ہندوستانی معیشت	الک گھوش / محمد خلیق	۱۳۴/=
330.	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشنوں کا فروغ ۱۸۵۱ء تا ۱۹۰۰ء	رادھے شیام رنگٹا / غلام حیدر	۲۱/۵۰
331.	ہندوستانی صنعتوں میں انصرام عملہ	نجم الحسن	۸/۷۵
332.	ہندوستان کی معاشی تاریخ (وکٹوریہ کے عہد حکومت میں 1837 تا 1900) (حصہ دوم)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۲۶/=

سائنسی اور تکنیکی کتابیں

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
333.	آبیات	محمد ابراہیم	۱۰/=
334.	آسان اردو شارٹ ہینڈ	سید راشد حسین	۴۰/=
335.	ایٹم کیا ہے؟	احمد حسین	۴/۵۰
336.	بائیو گیس پلانٹ	ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۵/=
337.	برقی توانائی	انجم اقبال	۱۲/=
338.	پرندوں کی زندگی اور ان کی معاشی اہمیت	محشر عابدی	۱۱/=
339.	پیڑ پودوں میں وائرس کی بیماریاں	رشید الدین خاں	۶/۵۰
340.	پیمائش و نقشہ کشی	محمد انعام اللہ	۲۰/=
341.	تاریخ طبعی (حصہ اوّل)	پروفیسر شمس الدین قادری	۱۰/=
342.	تاریخ طبعی (حصہ دوم)	پروفیسر شمس الدین قادری	۲۴/=
343.	تاریخ ایجادات	ایگن لارسن / صالحہ بیگم	۳۰/=
344.	تکملی احصاء برائے بی۔اے۔، بی۔ایس۔سی۔	شانتی نرائن / سیّد ممتاز علی	۲۲/۲۵
345.	ٹرانسسٹر کے بنیادی اصول	سید اقبال حسین رضوی	۱۱/۲۵
346.	جدید الجبرا اور مثلثات برائے بی۔اے۔	ٹیلمر ج پی۔ وینس۔ ایس، اے، ایل، شیروانی	۱۵/=
347.	خاص نظریۂ اضافیت	حبیب الحق انصاری	۱۲/=
348.	دھوپ چولھا	ایم۔ایم۔ ہدیٰ / ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۲/=
349.	راست و متبادل کرنٹ	عبدالرشید انصاری	۱۵/=
350.	سائنس کی باتیں	اندر جیت لال	۱۱/۵۰
351.	سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل)	سکلف اور سکلف / انیس الدین ملک	۱۰/۵۰
352.	سائنس کی کہانیاں (حصہ دوم)	سکلف اور سکلف / انیس الدین ملک	۱۲/=
353.	سائنس کی کہانیاں (حصہ سوم)	سکلف اور سکلف / انیس الدین ملک	۵/=
354.	علم کیمیا (حصہ اول) (چھٹی طباعت)	مترجم: ڈاکٹر محمد سجاد رضوی	۵/=
355.	علم [illegible] (حصہ دوم)	مترجم: ارشد رضوی	۳/=

356.	فلسفہ، سائنس اور کائنات	ڈاکٹر محمود علی سڈنی	۵۵/=
357.	فن طباعت (دوسرا ایڈیشن)	بلجیت سنگھ مطیر	۱۱/۵۰
358.	فن خطاطی وخوشنویسی اور مطبع منشی نول کشور کے خطاط	امیر حسن نورانی	۳۶/=
359.	کلاسیکی برق ومقناطیسیت مترجم: بی بی سکینہ	واف کانگ۔ اپچ پوفسکی میلیا فلپس۔	۵۰/=
360.	کوئلہ	نفیس احمد صدیقی	۲۲/=
361.	گنے کی کھیتی	سید مسعود حسن جعفری	۱۵/=
362.	گھریلو سائنس (حصہ ششم)	مترجم: شیخ سلیم احمد	۱۸/=
363.	گھریلو سائنس (حصہ ہفتم)	مترجم: ایس۔ اے۔ رحمان	۱۸/=
364.	گھریلو سائنس (حصہ ہشتم)	مترجم: تاجور سامری	۲۸/=
365.	محدد جیومیٹری	گورکھ پرشاد اور ایچ، سی، گپتا / نثار احمد خاں	۳۵/=
366.	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	ڈبلیو ایچ مورلینڈ / جمال محمد	۱۴/۵۰
367.	مغل ہندوستان کا طریق زراعت	عرفان حبیب / جمال محمد	۳۴/۵۰
368.	موزوں ٹکنالوجی ڈائرکٹری	ایم۔ ایم۔ ہدیٰ / خلیل اللہ خاں	۲۸/=
369.	نوریات	ایف۔ ڈبلیو سیرس / آر۔ کے۔ رستوگی	۲۲/=
370.	ہندوستان کی زراعتی زمینیں اور ان کی زرخیزی	سید مسعود حسین جعفری	۱۳/=
371.	ہندوستان میں موزوں ٹکنالوجی کی توسیع کی تجویز	ایم۔ ایم۔ ہدیٰ / ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۰/=
372.	حیاتیات (حصہ دوم)	قومی اردو کونسل	۵/=
373.	سائنس کی تدریس (تیسری طباعت)	ڈی این شرما / آر سی شرما / غلام دستگیر	۸۰/=
374.	سائنسی شعاعیں	ڈاکٹر احرار حسین	۱۵/=
375.	فن ضم تراشی	کلیش سنہاد نیش / اظہار عثمانی	۲۲/=
376.	گھریلو سائنس	طاہرہ عابدین	۳۵/=
377.	منشی نول کشور اور ان کے خطاط وخوشنویس	امیر حسن نورانی	۱۳/=
378.	طبیعیات کے بنیادی تفوات	آرتھر بیزر / احمد وکیل	

قانون

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
379.	انتظامی قانون کے اصول	ایم۔پی۔ جین	زیر طبع
380.	بھارت کا آئین	وزارت قانون وانصاف حکومت ہند	زیر طبع
381.	ہندوستان کی قانونی تاریخ (حصہ اوّل)	ایس۔این۔ جین	۲۷/۷۵
382.	ہندوستان کی قانونی تاریخ (حصہ دوم)	ایم۔پی۔ جین / انوار الیقین	۲۶/۵۰
383.	موجز القانون	چاند پوری	۷۷/=

بچوں کا ادب

نمبر شمار	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
384.	آدم زاد پری لوک میں	ضمیر درویش	۱۱/=
385.	آرٹ کی کہانی	سیما پرویز	۱۲/=
386.	اچھی چڑیا	محمد شفیع الدین نیّر	۱۰/=
387.	اخبار کی کہانی	غلام حیدر	۱۱/۵۰
388.	اقبال اور بچوں کا ادب	زیب النساء بیگم	۱۷/=
389.	ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	۱/۸۵
390.	اڑنے والا گینڈا	منور ماجونا	۱۰/۵۰
391.	اشوک کی پتنگ	ماسگریٹ گڈ	۷/۵۰
392.	اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	۱۱/=
393.	اکبر الہ آبادی	صغرا مہدی	۴/۵۰
394.	انجان ملکوں کے کھوجی	ثریا جبیں	۱۲/=
395.	ان سے ملئے (طبع ثانی)	منوہر ورما / طلعت عثمانی	۱۲/=
396.	انوار سہیلی کی کہانیاں	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۱۰/۵۰
397.	انوکھی کہانیاں	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۲/۲۵
398.	انوہا اور کالا کنواں	صالحہ عابد حسین	۳/۱۵
399.	اڈیسی	ہومر / اطہر پرویز	۷/=
400.	اولمپک گیمس	صفدر حسین	۱۲/=

401.	اونٹ راجا	پریمار لتا شنکر	۴/۵۰
402.	ایشیا اور یورپ کی کہانیاں	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۴/۵۰
403.	ایک دن کا بادشاہ	باز گو اطہر پرویز	۱۸/=
404.	ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ	باز گو اطہر پرویز	۹/=
405.	اینڈرسن کی کہانیاں	باز گو اطہر افسر	۴/۵۰
406.	ایلیس آئینہ گھر میں	مترجم: عبدالحی	۱۲/=
407.	بابر نامہ	مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
408.	باتیں کرنے والا غار	دولت ڈونگاجی / اے کے لونگیا	۳/۵۰
409.	باپو اور بچے	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن / تاجور سامری	۲/۲۵
410.	بچوں کے حالی	صالحہ عابد حسین	۳/۷۵
411.	بچوں کے ڈرامے	اظہر افسر	۱۰/۵۰
412.	بچوں کے لیے کچھ اور مختصر کہانیاں	عائشہ خاتون (مترجم)	۲۵/=
413.	بچوں کی مسکان	سیّدہ فرحت	۳/۷۵
414.	بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	۵/=
415.	بچوں کے نہرو	ایم چیلاپتی راؤ / پریم نارائن	۷/۵۰
416.	بکری دو گاؤں کھا گئی	م۔ ندیم	۹/=
417.	بگلا اور کیکڑا	الکا شنکر	۷/=
418.	بوڑھیا اور کوا	شنکر	۷/۵۰
419.	بوستاں کی کہانیاں	باز گو علقمہ شبلی	۱۵/=
420.	بے زبان ساتھی	وکیل نجیب	۱۰/=
421.	بیربل کی شوخیاں	ثریا جبیں	۸/=
422.	بے زبانوں کی دنیا	حیدر بیابانی	۱۸/=
423.	بینک کی کہانی	غلام حیدر	۴/۵۰
424.	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ اوّل)	بازگو ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
425.	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ دوم)	بازگو ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
426.	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ سوم)	بازگو ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	۱۲/=
427.	بھکاری راجہ	کے شیو کمار / ساحر ہوشیار پوری	زیر طبع
428.	بھوت پریت	ترقی اردو بیورو	۱۰/=
429.	پانی کا جہاز اور اس کی تکنیک	نوکلا رائے / اسلم پرویز	۱۲/=
430.	پتھروں کے دل	وشا کا چنچی / غلام حیدر	۱۲/=
431.	پردیسی	پرتھما ناتھ / آصف نقوی	۱۵/=

.432	پریم چند	پروفیسر قمر رئیس	۱۱/۵۰
.433	پریم چند کی کہانیاں	جوگندر پال	۲۵/=
.434	پسند	ملیا تھامس	۹/۵۰
.435	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ اول)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	زیر طبع
.436	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ دوم)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	زیر طبع
.437	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ سوم)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	۵/۷۵
.438	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ چہارم)	کے۔ شیو کمار / اطہر پرویز	۷/=
.439	پودوں اور جانوروں کی دنیا	اطہر پرویز	۲/۵۰
.440	پوربی دیسوں کی کہانیاں	کلا تھیرانی / عائشہ صدیقی	۱۹/=
.441	پیڑ راجا	دیپکا جیدکا / غلام حیدر	۱۵/=
.442	پیسے کی کہانی	اطہر پرویز	۳/۵۰
.443	پھول مالا	سعادت نظیر	زیر طبع
.444	پھلواری	منیر الحق صدیقی	۸/۵۰
.445	ترقی اردو ریڈر	حیات اللہ انصاری	۱۴/=
.446	تین مچھلیاں	دولت ڈونگاجی / اے۔ اے۔ لونگیا / این۔ این۔ مجمدار	۵/۵۰
.447	جانور اور ان کے بچے	ڈی۔ سی۔ سولانکی	۲/۲۵
.448	جمبو کی تربیت	آر۔ کے۔ مورتھی	۷/=
.449	جنوبی وسطی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں	محمد امین	۱۰/=
.450	چار درویشوں کا قصہ	باز گو نور الحسن نقوی	۱۱/=
.451	چنکو	سریکھا پانندیکر	۹/۵۰
.452	چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	۱/۵۰
.453	چڑیا اور راجہ	مدھو شنڈن	۷/=
.454	چڑیاں	سلطان آصف	۳/=
.455	چکبست	رام لال نابھوی	۱۸/=
.456	چلو چاند پر چلیں	جے پرکاش بھارتی / ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	۵/=
.457	چمکی نے خط ڈالا	متر اپھوکن / عائشہ خاتون	۱۵/=
.458	چندا ماما کے گاؤں میں	قاضی مشتاق احمد	۱۵/=
.459	چندر دیو	ایم لتا / کشور سلطان	۳/=
.460	چوبیس مختصر کہانیاں	عارف نقوی	۴۰/=
.461	حاتم طائی کا قصہ	مرتب: نور الحسن نقوی	۱۳/=

462.	حالی	صالحہ عابد حسین	۴/=
463.	حرف حرف نظم	وقار خلیل	۵/=
464.	خط کی کہانی	غلام حیدر	۱۱/=
465.	خطرناک راستے	وکیل نجیب	۹/۵۰
466.	خواب مشین	سیر گھوش / رچا بنسل اقبال مہدی (مترجم)	۲۴/=
467.	خواجہ میر درد	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۴/۵۰
468.	دلچسپ کہانیاں	ڈاکٹر رام آسرا راز	۱۵/=
469.	دلکش نظمیں	ابرار کرت پوری	۶/=
470.	دھنک کا جھولا	مکتا مخیل / زاہدہ خاتون	۱۵/=
471.	دیس دیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۶/۵۰
472.	ڈارون کا نظریۂ ارتقاء	ڈاکٹر افتخار احمد	۷/۵۰
473.	ڈاکٹر راجندر پرشاد	عبداللطیف اعظمی	۱۱/=
474.	ڈیوی ڈیلز کا نیا طالب علم	میتھیو پائمکٹ / زاہدہ خاتون	۳۰/=
475.	رابن ہڈ کے کارنامے	تلخیص و ترجمہ ایم۔ ندیم	۱۵/=
476.	رابنسن کروسو	ڈینیل ڈیفو / م۔ ندیم	۱۳/=
477.	راجو اور اکبر	جین بوجور	۴/۷۵
478.	راجہ رام موہن رائے	چندر لال گھوش / انعام الحق	۳/۵۰
479.	رتن ناتھ سرشار	پریم پال اشک	۴/۲۵
480.	رینگنے والے جانور	قیصر سرمست	۱۲/=
481.	سات رانیاں	شنکر	زیر طبع
482.	سب کے باپو	سلطان آصف فیضی	۴/۵۵
483.	سجاتا اور جنگلی ہاتھی	شنکر / ایس۔ ایم۔ شاہ نواز	۴/=
484.	سچی کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	۱۲/=
485.	سرسید احمد خاں	میر نجابت علی / سید ابوالحسنات	۷/=
486.	سنہری ہرن	شنکر	۹/۵۰
487.	سنو کہانی	منصور نقوی	۳۰/=
488.	سوڈان کی مزے دار کہانیاں	محمد امین	۸/۵۰
489.	سونالی کا دوست	شنکر	۷/=
490.	شاہنامہ کی کہانیاں	باز گو ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی	۱۱/=
491.	شریف زادہ	حفیظ عباسی	۱۲/=

.492	شکاری شکار اور جنگل سے پیار	رضیہ تحسین	۱۱/=
.493	شہنشاہ اثمار آم	تاباں نقوی امروہوی	۱۱/=
.494	شیر اور خرگوش	ششکر	۷/=
.495	صبح کی پری	رتن سنگھ	۳/=
.496	صفر کی کہانی	دلیپ ایم سالوی پروفیسر طلعت عزیز (مترجم)	۱۲/=
.497	عظیم سائنس داں	ڈاکٹر احرار حسین	۱۸/=
.498	عقل مند مچھیرے اور دوسرے ڈرامے	مرتب: م۔ ندیم	۷/=
.499	فٹ بال کی کہانی	مترجم: راج نرائن راز	زیر طبع
.500	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۱۶/=
.501	فضائی اور خلائی اڑان	شاداں پرویز	۳/۲۵
.502	قصہ ہائے رنگ رنگ	صمد بھرتگی / شعیب اعظمی	۲۹/=
.503	کٹھ پتلی ایک تماشہ	سطوت رسول	۷/=
.504	کچھوا اور خس	ششکر	۷/=
.505	کچھ ہندستانی چڑیاں	این۔ این۔ مجمدار / آصف نقوی	۳۲/=
.506	کیمیا کی کہانی	سید شہاب الدین دسنوی	۱۶/=
.507	گاندھی اہنسا کا سپاہی	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن / محمد حسین قدوائی	۱۲/۵۰
.508	گاندھی جی کے مختلف روپ	الوبند ھوپادھیائے	۱۵/=
.509	گڈو میاں	نورالحسنین	۶/=
.510	گلستاں کی کہانیاں (طبع ثانی)	امیر حسن نورانی	۱۴/=
.511	للی پٹ کا سفر	جوناتھن سوئفٹ / م۔ ندیم	۲/۱۰
.512	لمبو اور موٹو	منوراما جوتا	۵/۵۰
.513	مالوے کی لوک کہانیاں	ڈاکٹر صادق	۵/۵۰
.514	محمد حسین آزاد	نند کشور وکرم	۵/=
.515	مچھلیاں اڑنے لگیں!	لاولن تعدانی / تسنیمہ زیدی	۱۲/=
.516	مرزا عظیم بیگ چغتائی	ڈاکٹر ہارون ایوب	۱۲/=
.517	مشینی گھوڑا	باز گوا طہر پرویز	۱۴/=
.518	مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں	محمد امین	۹/=
.519	منٹو اور آنکلو	شیریں نیازی	۱۲/=
.520	منو کی کہانی	دلیپ۔ م۔ سالوی / پروفیسر طلعت عزیز	۱۲/=
.521	مولانا روم کی کہانیاں	مرتب: محمد حفیظ الدین	۶/۵۰

522.	میرے غبارے	نوین مینن / زاہدہ خاتون	۱۵/=
523.	میگھ ناتھ ساہا	کملیش رے مترجم: ایس کے۔ سنگھ	زیر طبع
524.	موہن جوداڑو کی مایا	ملک راج آنند	زیر طبع
525.	مہاگری	مرتب: حفیظ الکبیر پرواز	۳/۷۵
526.	میر تقی میر	پروفیسر نثار احمد فاروقی	زیر طبع
527.	میری والدہ	سکرن سری واستوا	۹/۵۰
528.	میں کیا بنوں گا	میری لن ہرش	۹/۵۰
529.	ناگ متی	ساوتری / سلمیٰ اجمیری	۳/=
530.	نصوح کا خواب	مرتب: حفیظ عباسی	۳/۵۰
531.	ننھی جل پری	ہانس کرسٹیان انڈرسن / ہرچرن چاولہ	۵/۵۰
532.	ننھے منے گیت	کیدار ناتھ کومل	۱۳/=
533.	نورتن کی کہانیاں	بازگو شمیم احمد	۲۰/=
534.	نورجہاں	ایم۔ آر۔ کوہلی	۷/=
535.	نیاکلینڈر اور دوسری کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	۷/=
536.	نہرو کے ان دیکھے روپ	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن /	۱۳/=
537.	وسطی جنوبی افریقہ اور ملاگاسی کی مزیدار کہانیاں	محمد امین	۱۰/=
538.	وفادار نیولا	شنکر	۷/=
539.	ہاتھی اور پانی کی ٹنکیاں	شکھا مکرجی / عائشہ خاتون	۱۵/=
540.	ہری اور دوسرے ہاتھی	شنکر / پریم نارائن	۶/=
541.	ہمارا سنیما	پریم پال اشک	۱۰/=
542.	ہمارا قومی گیت	سید محمد ابراہیم فکری	۱۰/=
543.	ہماری لوک کہانیاں	پریم پال اشک	۱۸/=
544.	ہمارے ٹیگور	صفدر حسین	۸/۵۰
545.	ہمارے جانباز	پریم پال اشک	۱۳/=
546.	ہمالیہ کے بنجارے	شیام سنگھ ششی	۶/۵۰
547.	ہندوستان کی آبادی	محمد ابوذر	۸/۷۵
548.	ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ اول)	صفدر حسین	۱۵/=
549.	ہندوستان کی عظیم عورتیں	صفدر حسین	۱۵/=
550.	ہندوستان کی مایہ ناز ہستیاں و دیگر مضامین	پی۔ شیخ علی	۳۱/=
551.	ہندوستان کے قبائلی بچے	ڈاکٹر ششی / رام پرکاش راہی	۱۱/۹

552.	انوکھی پہیلی	ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی	۱۵/=
553.	ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ دوم)	صفدر حسین	۱۵/=
554.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۱)	اقبال مہدی زیدی	۳۵/=
555.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۴)	غلام حیدر (مترجم)	۳۵/=
556.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۵)	رفیق محمد شاستری	۳۵/=
557.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۷)	فرحت قمر	۳۵/=
558.	گلابی اور نیلے پنے والی جانوبلی	تھنگم کرشنن / مترجم: نجمہ نقوی	۱۵/=
559.	ہوائی جہاز اور اس کی تکنیک	نوکلارائے / مترجم: سید رضا حیدر	۱۲/=
560.	ریل گاڑی کیسے کام کرتی ہے	نوکلارائے / مترجم: تسکین زیدی	۱۲/=
561.	دوست بنائے نئے نئے	اکا شنکر / مترجم: نجمہ نقوی	۲۰/=
562.	دائی اور بھوت	دیویکا رنگاچاری / مترجم: شمیمہ بیگم	۱۵/=
563.	ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ (حصہ اول)	شنکر / خسرو متین	۳۷/=
564.	بچوں کی کہانیاں	مترجم: تسنیمہ زیدی	۲۵/=
565.	جانداروں اور جانوروں کی عجیب و غریب عادتیں اور خصلتیں	راجندر کمار راجیو / مترجم: ایس۔ اے۔ رضوی	۲۸/=
566.	ننھیال میں گزرے دن	شنکر / مترجم: حیدر جعفری سید	۲۳/=
567.	جادوئی سرکس	شکھا مکرجی / مترجم: آصف نقوی	۱۵/=
568.	پُر اسرار پھول	لولین تھادانی / مترجم: انیس احمد	۱۵/=
569.	جھیل کی دمیں	ممتا پانڈیا / مترجم: سید شاہ ناز عباس	۱۵/=
570.	ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے	نوکلارائے / مترجم: شبانہ اسلام	۱۲/=
571.	ٹیلی ویژن اور اس کی تکنیک	نوکلارائے / مترجم: عارف نقوی	۳۵/=
572.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۳)	مترجم: غلام حیدر	۳۵/=
573.	یاد کیجیے ہمارے رہنما (۲)	مترجم: سبط اصغر رضوی	۳۵/=
574.	چڑیا گھر کی بطخ	ہری گوپال سوامی شری نواسن / مترجم: نجمہ نقوی	۱۵/=
575.	ممانی کا کارنامہ	مترا پھوکان / مترجم: خسرو متین	۱۵/=
576.	پائلٹ کرسٹوفر	رونیا گاندھی / مترجم: صدف زیدی	۱۵/=
577.	لڑھکتا پہیا	آشا نہمیا / مترجم: ڈاکٹر صغرا مہدی	۱۵/=
578.	راجو کا مزے دار تماشا	بی۔ فاطمی / مترجم: کمال احمد زیدی	۱۵/=
579.	دادی کی ساڑی	آشا نہمیا / مترجم: ڈاکٹر صغرا مہدی	۱۵/=
580.	چھوٹو نے تیرنا سیکھا	سپنادت / مترجم: شہناز اقبال	۱۵/=

طب و معالجات

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
581.	امراض النساء (چوتھا ایڈیشن)	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۱۵۰/=
582.	امراض الاطفال	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۹۲/=
583.	امراض اور ان کی حقیقت	حکیم ایم۔ حسّام صدیقی	۲۳/=
584.	بچے کی صحت	ڈاکٹر مس ستیہ گپتا ر شمیم نکہت	۶/=
585.	پیٹ کے کیڑے	محمد رفیق اے۔ ایس	۳۰/=
586.	تاریخ طب	حکیم محمد حسان	۱۱۰/=
587.	تشریح الہیکل (اول)	حکیم ایس۔ ایم۔ کمال الدین حسین ہمدانی	۱۱/=
588.	تشریح الاحشاء	حکیم ایس۔ ایم۔ کمال الدین حسین ہمدانی	۲۳/=
589.	تیمارداری، (ترمیم واضافے کے ساتھ) (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر حسین فاروقی	۱۶/=
590.	چائنیز طب آکیو پنکچر اور موکسی بوشن کے بنیادی اصول	ڈاکٹر محمد ظہیر الدین	۱۲/=
591.	چند عام بیماریاں	حسین فاروقی	۹/=
592.	درد۔ علامت اور علاج	حکیم ابو سعد خالد جاوید شمسی	۱۷/=
593.	سرطان کیا ہے؟	محمد برہان حسین	۷/=
594.	شراب نوشی اور منشیات کی لت	ڈاکٹر حسین فاروقی	۸/=
595.	علاج بذریعہ غذا	حکیم احتشام الحق قریشی	۱۲۱/=
596.	علم الادویہ (حصہ سوم)	حکیم محمد مستان علی	۴۶/=
597.	عہد مامون کے طبی وفلسفیانہ ترجمہ کا تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر عشرت اللہ خاں	۴۰/=
598.	فطری علاج	حسن الدین احمد اور غلام احمد	۱۲/=
599.	قبالیات	محمد عباس رضوی	۶۲/=
600.	قدیم علم الامراض	حکیم واثق ملک امین	۳۴/=
601.	کتاب المرشد	محمد بن زکریا رازی ر محمد رضی السلام ندوی	۱۵/=
602.	کلیات نبض و بول و براز	حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمن	۴۷/=
603.	ماہیت الامراض	ڈاکٹر سید اسد رضا زیدی	۴۰/=
604.	مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر	حکیم الطاف احمد اعظمی	۱۱/=

605.	معالجات (حصہ اوّل)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۰۴/=
606.	معالجات (حصہ دوم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۲۸/=
607.	معالجات (حصہ سوم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۳۰/=
608.	معالجات (حصہ چہارم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۰۰/=
609.	میزان الطب	حکیم محمد اکبر	زیر طبع
610.	موجز القانون	مترجم۔ کوثر چاندپوری	۲۰/=
611.	نسائیات (طبع ثانی)	حکیم سیّد محمد عباس رضوی	۶۴/=
612.	ہماری غذا	شکیل احمد	۹/۵۰
613.	ہمارے جسم کا موجزاتی نظام	قیصر سرمست	۳۳/=
614.	ہندوستان کے مشہور اطباء	حکیم حافظ سیّد حبیب الرحمٰن	۱۸/=
615.	یونانی طب میں مانع حمل ادویہ اور تدابیر	حکیم ام الفضل	۱۲/=
616.	یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین علی	۶۰/=
617.	اصول طب	سید کمال الدین حسین ہمدانی	۱۱۶/=
618.	پیڑ پودوں پر وائرس کی بیماریاں	رشید الدین خاں	۶/۵۰
619.	ذہنی حفظان صحت	مترجم: ہرالڈ ڈبلو: نارڈ / معین الدین	۶۰/=
620.	منشیات	محمد رفیق اے ایس	۴۰/=

Subscribe "Urdu Duniya" Today

زر سالانہ : 100 روپے

سالانہ خریداری فارم

میں "اردو دنیا" کا / کی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ / 125 روپے کا چیک نمبر.................. تاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ آپ "اردو دنیا" ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام..................

پتہ..................

....

.... فون :..................

دستخط

نوٹ : رقم بذریعہ منی آرڈر بھی ارسال کی جاسکتی ہے۔

Subscribe "Fikr O Tehqeeq" Today

زر سالانہ : 100 روپے

سالانہ خریداری فارم

میں "فکر و تحقیق" کا / کی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ / 125 روپے کا چیک نمبر.................. تاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ آپ "فکر و تحقیق" ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام..................

پتہ..................

....

.... فون :..................

دستخط

نوٹ : رقم بذریعہ منی آرڈر بھی ارسال کی جاسکتی ہے۔

Registered with the registrar of News Papers for India RNI NO. 69302/98

Quarterly **Fikr-O-Tahqeeq** New Delhi

Vol. III Jan., Feb., March 2000 Issue-1 ☎ : 6103381

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Education, Ministry of Human Resource Development,
Government of India, West Block - I, R.K. Puram, New Delhi

دنیائے اُردو میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے

● کوئی کتاب چھپتی ہے ● کوئی رسالہ نکلتا ہے ● کوئی تقریب ہوتی ہے ● نصابی کتابوں کی فراہمی ● تکنیکی اصطلاحات کے معاملات ● لغات کی تدوین ● اُردو میڈیم طلباء کی دشواریاں ● اُردو تعلیم و تدریس کے مسائل ● قومی اُردو کونسل کی سرگرمیاں ● دوسرے رضاکار اُردو اداروں مثلاً اُردو اکادمیوں کی سرگرمیاں ● کتابوں پر انعامات ● ادیبوں کو اعزاز، اکرام استقبالیہ ● معاصر اخبارات سے اُردو کے متعلق اہم خبریں ● اہم مضامین ● فروغِ اُردو کے نئے امکانات ● افکار و اذکار ● تبصرے ● اہم مضامین اور اُردو زبان و ادب کی ہمہ جہت ترقی کے امکانات و مسائل پر گفتگو اور مذاکرے وغیرہ کے ساتھ کلاسیکی ادب کے نثری اور منظوم شہ پاروں پر مشتمل ماہنامہ **اردو دنیا** دہلی سب کچھ ریکارڈ کرتا ہے اور خوب صورتی کے ساتھ اپنے قارئین کے لیے پیش کرتا ہے۔ آج ہی طلب کیجیے۔

فی شمارہ 10 روپے زرِ سالانہ 100 روپے۔ کتب فروشوں کے لیے 5 سے زیادہ کاپیاں منگوانے پر 40 فیصد کی رعایت دی جائے گی۔

Printed, Edited, and Published by Dr. M. Hamidullah Bhatt Director, National Council For Promotion Of Urdu Language at Liberty Art Press, Darya Ganj, New Delhi-110002. and published from West Block I, R.K. Puram New Delhi. Owner NCPUL, Dept. of Education M/o HRD, Government of India.